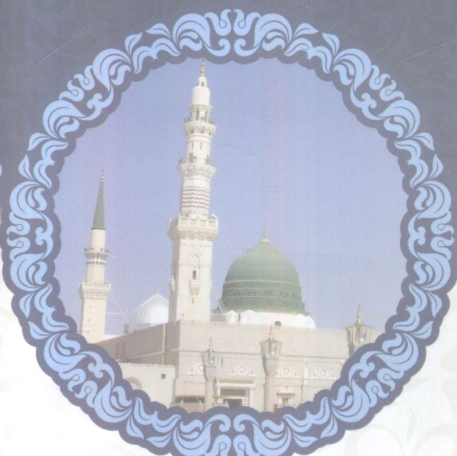
نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیامِ رحمت





مولانا محمد عبداللہ طارق

مکتبہ قاسم العلوم

نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیامِ رحمت

مولانا محمد عبد اللہ طارق

مکتبہ قاسم العلوم

نام کتاب

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیامِ رحمت

مصنف

مولانا محمد عبداللہ طارق

اہتمام ——— ملک اسد علی قاسمی
مطبع ——— گنج شکر پریس
ناشر ——— مکتبۃ قاسم العلوم

ڈسٹری بیوٹرز

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، پاکستان
042-37231119 , 0321-4021415

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

ذکر رحمۃ للعالمین قرآن مجید میں

❶

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلاَّ رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ۔

"اے (محمد رسول اللہ!) ہم نے تو آپ کو تمام عالموں کے لیے سراسر رحمت بنا کر بھیجا ہے" (۱۰۷/۲۱)۔

❷

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلاَّ کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

"اے (محمد رسول اللہ!) ہم نے آپ کو تمام کے تمام انسانوں کے لیے بشارت سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے نہیں" (۲۸/۳۴)۔

❸

وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلاَّ خَلاَ فِیْھَا نَذِیْرٌ۔

"کوئی قوم ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو" (۲۴/۳۵)۔

❹

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔

"اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا جس نے پیغام دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو" (۳۶/۱۶)۔

۵

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

(اے سعادت مند انسانو!) ''کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر اور ان تعلیمات و ہدایات پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہیں اور اس ہدایت پر بھی جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی تھی اور جو موسیٰؑ عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں'' (۲/۱۳۶، ۱۳۷)۔

۶

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

''بخدا ہم نے (اے محمد) تم سے پہلے مختلف قوموں کی طرف ہدایت بھیجی مگر (اس کے بعد) شیطان نے ان کے غلط اعمال کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا چنانچہ آج وہی ان کا سرپرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے حقدار بن گئے ہیں۔ اور ہم نے (اے محمد رسول اللہ!) آپ پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ آپ اس حقیقت کو ان کے سامنے واضح کر دیں جس میں ان کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے اور اس لیے تاکہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہو ان تمام لوگوں کے لیے جو اس کو اپنائیں اور اس کی پیروی قبول کر لیں'' (۱۶/۶۳، ۶۴)۔

۷

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ

الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ط قَدْجَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ O لا یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍO

''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی ان چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپائے ہوئے تھے اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس یہ اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آ گئی ہے جس کے ذریعہ وہ ان لوگوں کو جو اللہ کی پسند کے مطابق چلتے ہیں امن سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے انہیں (طرح طرح کے) اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے'' (۵/۱۵/۱۶)۔

۸

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ ط فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَO

''وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے وہ تمام بوجھ اتار دیتا ہے اور ان تمام بندشوں کو کاٹ ڈالتا ہے جن میں وہ دبے اور جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تائید و حمایت کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (پس جو لوگ ایسا کریں گے) وہی فلاح پانے والے ہیں'' (۷/۱۵۷)۔

۹

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًاO

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کے اوپر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر لوگوں کے درمیان فیصلے کریں اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی اور وکیل نہ بنیں'' (۴/۱۰۵)۔

❿

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول (محمد مصطفیٰ) کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اسے تمام دینوں اور تمام طریقہائے زندگی پر غالب کر دے'' (۴۸/۲۸)۔

⓫

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا نِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی خدا اور معبود نہیں، اسی کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر جو خدا اور اس کے احکام وہدایات پر (خود بھی) ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھا راستہ پا جاؤ'' (۷/۱۵۸)۔

⓬

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط

''اور (اے نبی! آپ کہہ دیجئے!) میری طرف یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تم کو اور ہر اس شخص کو خبردار کر دوں جسے یہ پہنچے'' (۶/۱۹)۔

⓭

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ○

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ تو اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کر دینے والے ہیں“ (۳۳/۴۰)۔

۱۴

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً ط

”آج میں نے تمہارا دین (اور طریقہ زندگی) تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا طریقہ پسند کیا ہے“ (۵/۳)۔

۱۵

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا○

”تو آپ تو (اے نبی!) شاید ان لوگوں کے پیچھے خود کو مارے غم کے ہلاک کر لیں کے اگر وہ ان ہدایات وتعلیمات پر ایمان نہ لائے“ (۱۸/۶)۔

۱۶

”یہی مضمون سورت ۲۶/آیت ۳/میں بھی آیا ہے۔

ذکر رحمۃ للعالمین حدیث رسولؐ میں

❶

اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاه.

''میں تو اللہ کی طرف سے بخشا ہوا رحمت کا ایک تحفہ ہوں''۔ (بیہقی، شعب الایمان عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)۔

❷

.. وكان النبي يُبعث إلى قومه خاصةً، وبُعِثتُ إلى الناس عامةً.

...''تمام نبی خاص اپنی اپنی قوموں کے پاس بھیجے جاتے تھے لیکن مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے''۔ (بخاری، مسلم عن جابر رضی اللہ عنہ)

❸

أنا محمد، وأحمد، والمقفي، والحاشر، ونبي التوبة، ونبي الرحمة.

''میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں آخری نبی ہوں، میں جمع کرنے والا ہوں میں نبی توبہ ہوں، میں نبیِ رحمت ہوں''۔ (مسلم عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ)

❹

...دعوة إبراهيم، وبشارة عيسى، ورؤيا أُمّي التي رأت حين وضعتني وقد خرج لها نورٌ أضاء لها منه قصور الشام.

"میں ابراہیم کی دعاء، عیسیٰ کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو انہوں نے دیکھا تھا کہ ان سے ایک نور نمودار ہوا ہے جس سے ان کو ملک شام کے محلات صاف نظر آ گئے"۔
(البغوی، شرح السنۃ عن العرباض بن ساریۃؓ)

۵

إنما أنا لكم مثل الوالد لولده.
"میں تم تمام انسانوں کیلئے (شفقت و مہربانی اور چھوٹی چھوٹی باتیں تک بتانے کے معاملے میں) ایسا ہوں جیسے باپ اپنی اولاد کیلئے"۔ (ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابوعوانہ، دارمی عن ابی ہریرۃؓ)

پُرحکمت اشعار

مثلِ کلیم ہو اگر، معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے، آتی ہے بانگِ لاَ تَخَف

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مَۓ لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ اِلّاَ

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اسکا مقام اور ہے، اسکا نظام اور ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حضرت آدم علیہ السلام جو پوری انسانیت کے مورثِ اعلیٰ اور سلسلۂ بشریت کا نقطۂ آغاز ہیں وہ اپنی اس صفت کے ساتھ ہی ساتھ پیغمبر اور نبی بھی ہیں، ان کے رب نے ان کو پیدا کر کے جس طرح ان کی اور ان کی اولاد کی مادی اور جسمانی ضرورتوں کے لیے روئے زمین پر ہر طرح کا سامان فراہم کیا اسی طرح اس کی رحمت بے پایاں نے ان کی روحانی اور اخلاقی ضرورت کے لیے اپنی طرف سے پیغام رسانی کا سلسلہ بھی شروع ہی سے جاری کر دیا تھا۔

قرآن مجید جو اللہ کا کلام اور انسانیت کے لیے آخری آسمانی صحیفہ ہے اس کی شروعات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے، اس بسم اللہ میں بھی اور اس کے بعد قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت کے شروع میں بھی اللہ تعالیٰ نے خود کو "رحمٰن" اور "رحیم" کی صفت سے متعارف کرایا ہے یعنی بہت مہربان اور انتہائی رحم کرنے والا، پھر پہلی ہی سورت کے شروع ہی میں اس نے اپنا دوسرا تعارف "رب العالمین" کرایا ہے یعنی تمام عالموں کا رب اور پالنے والا۔ اور اس کتاب کو رب العالمین سے اولیں وصول کرنے والی ہستی حضرت محمد رسول اللہ کو "رحمۃ للعالمین" قرار دیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اللہ جو کائنات کے ذرّے ذرّے کا پیدا کرنے والا اور اس کے وجود کو لے کر برابر چلنے والا اور ساری انسانیت کا پالنے والا اور ہر انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہے کیا اس کے

یہاں پالنے پوسنے کے لیے اور روئے زمین پر رہنے بسنے اور زندگی گزارنے کے لیے ایسی کوئی پابندی ہے کہ یہاں بس بھلے اور شریف لوگ ہی رہ سکتے ہیں؟ اللہ کے صرف فرمان بردار بندے ہی یہاں روزی پاسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! یہ دنیا ہر طرح کے انسانوں کے لیے پرورش گاہ اور ہر اچھے برے، اعلیٰ ادنی اور نیک وبد کے لیے ٹھکانا ہے۔

بس جس رب العالمین نے خود اپنی رحمت کا سایہ انتہائی عام رکھا ہے اچھے بُرے کی کوئی تفریق نہیں کی اسی طرح اس نے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ کو بھی انتہائی عام اور انسانیت کے ہر فرد کے لیے بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کے لیے ''رحمت'' قرار دیا ہے، جس طرح کوئی ایک بھی فرد بشر ''رب العالمین'' کی مہربانیوں سے محروم نہیں ہے ٹھیک اسی طرح کوئی ایک بھی فرد بشر محمد رسول اللہ کی شان ''رحمت للعالمینی'' سے بے نصیب اور غیر متعلق نہیں۔

ہر نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو قرآن مجید کی پہلی سورت سوہ فاتحہ (جسکا پڑھنا ہر نماز کی ہر رکعت میں ضروری ہے) کی پہلی ہی آیت میں پڑھتا ہے'' الحمد للہ رب العالمین'' (ہر تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) اور قرآن مجید میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ''وماارسلناک الا رحمة للعالمین'' (ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

اسی طرح ''رب العالمین'' نے ساری انسانیت کی رہنمائی کے لیے جو کتاب ''رحمۃ اللعالمین'' کے ذریعے بھیجی ہے اس کو بھی اس نے بہت عام رکھا ہے، اس کتاب کو اس نے نہ ''عربوں کے لیے کتاب ہدایت'' کہا نہ ''مسلمانوں کا ہدایت نامہ'' قرار دیا بلکہ ''ھدی للناس'' (سورہ ۲، آیت ۱۸۵) یعنی پوری نوع انسانی کے لیے پیغام ہدایت کہا ہے۔ اور قرآن مجید میں جگہ جگہ ''یا ایھاالناس...'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے یعنی اے بنی نوع انسان!

دنیا کے کسی بھی انسان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن مجید ''مسلمانوں کی کتاب'' ہے یا ''عربوں کی کتاب'' ہے، اور اگر کسی مسلمان کو یہ غلط فہمی ہو کہ قرآن مجید مسلمانوں کی کتاب ہے

تو اس کو بھی یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیے، قرآن مجید ہرگز کسی خاص قوم یا کسی خاص انسانی گروہ کے لیے یا تاریخ کے کسی مخصوص دور کے لیے نہیں ہے وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اور دنیا کے ہر فرد بشر کے لیے ہے، قرآن مجید کے اوپر اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کے وسیع اور لامحدود پیغام کو بہت تنگ اور محدود کر دیا جائے۔

خدائے "رب العالمین" اور "رحمٰن ورحیم" کی شان سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ اپنی ہدایت کی بارش کسی ایک قوم پر تو برسائے اور دوسری کو اس سے محروم کر دے، جس طرح اس روئے زمین پر پانی کی بارش کسی تفریق کے بغیر عام ہوتی ہے اسی طرح آسمانی ہدایت کی بارش بھی عام ہوتی ہے۔

بس خدائے "رب العالمین" "رحمان ورحیم" اور نبی اکرم "رحمۃ اللعالمین" کے پس منظر میں ہی اس کتاب کے ذریعہ یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا ان شاء اللہ۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی جمیع الانبیاء والمرسلین، خصوصا علی خاتمھم وأفضلھم أجمعین، ورحمۃ للعالمین وعلی من تبعھم من الثقلین إلی یوم الدین أمابعد.

نائن الیون (۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء) کو جو حادثہ امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر پیش آیا جس کا آج تک یہی پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا کرنے والا تھا کون؟ قرائن و شواہد یہ ہیں کہ یہ صیہونیت کی کارروائی تھی، کیوبا کے بزرگ رہنما فیڈرل کاسترو، وینز ویلا کے صدر ہیگو شاویز بلکہ خود امریکہ کے بہت سے ماہرین اور دانشوروں کا کہنا یہ ہے کہ ان حملوں میں خود امریکی حکام اور صف اول کے سربراہانِ مملکت ملوث ہیں، لیکن یہ رائے ''نقارخانے میں طوطی کی آواز'' بن کر رہ گئی ہے، امید ہے کہ آنے والا وقت ماضی کی سلوٹوں میں چھپے اس سچ کو تلاش کرنے میں کبھی نہ کبھی کامیاب ہو جائے گا۔

بہرحال اس واقعے کو اسلام دشمن لابی نے مسلم دنیا پر حملہ آور ہونے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بہت بڑا ہتھیار بنا لیا ہے اور چونکہ ہر طرح کا میڈیا بھی بدقسمتی سے اسی لابی کے قبضے میں ہے اس لیے اس سازش کے خلاف جو بھی آواز اٹھی اس کو پوری طرح دبا دیا گیا اور رفتہ رفتہ اب دنیا

دو حریف گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے:

۱-ایک گروہ ہے ظلم وجور کا علم بردار، جس کی سربراہی مغرب نے سنبھال رکھی ہے۔

۲-دوسرا گروہ ہے ظلم کا شکار، اور وہ امت مسلمہ ہے، چاہے وہ کہیں بھی ہو اور کسی بھی حال میں ہو، اس کے قصوروار ہونے کے لیے اتنی بات بہت کافی ہے کہ وہ ''مسلمان'' ہے۔ لفظ ''دہشت گردی'' جس کی آج تک کوئی معقول تعریف نہیں ہوسکی اسلام دشمن میڈیا نے اس کو ''مسلمان'' بلکہ زیادہ درست لفظوں میں ''مذہبی مسلمان'' کا مرادف بنادیا ہے اور آج کی اکیسویں صدی کی نام نہاد جدید دنیا میں جنگل کا قانون نافذ ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر بڑی طاقتیں ہر چھوٹی یعنی غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر حکومتوں سے ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ کرنے کے معاہدے کررہی ہیں اور خود مسلم حکومتیں بھی ''نادانی'' میں نہیں بلکہ ''مجبوری'' میں ان معاہدوں میں شریک ہیں، اور دہشت گردی کے خلاف لڑنے اور زیادہ درست لفظوں میں ''مسلم کشی'' کے معاہدے پر دستخط کررہی ہیں۔ ؎

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اور جو مسلم حکومتیں اس سراسر دھاندلی میں ان طاقتوں کا ساتھ نہیں دیتی ہیں انہیں مختلف بہانوں سے گھیرا جاتا ہے اور ایک ایک کرکے فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ افغانستان اور عراق فنا کردیے گئے ہیں پاکستان پر پنجے گڑے ہوئے ہیں اور ایران کا گھراؤ ہر طرف سے جاری ہے اور اب سعودی عرب پر بھی نشانہ ہے۔ ؎

آج وہ، کل ہماری باری ہے

اس عظیم عالمی الجھن کا واحد حل ''دعوت'' ہے، اسلام کی کھلی ہوئی مکمل دعوت۔ اس کے علاوہ اس عالم گیر آفت کا کوئی حل نہیں ہے، لیکن جس امت کی یہ ذمہ داری ہے اور جس قوم کے پاس اس زہر کا اصل تریاق موجود ہے اس کا حال یہ ہے کہ وہ نہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے اور نہ اس کے لیے مطلوبہ صلاحیت وسلیقہ سے آراستہ ہے، جیسا کہ ہم آئندہ ایک مستقل عنوان کے تحت

مسلمانوں کی قسمیں اوران میں سے ہر قسم کا حال لکھیں گے ان شاء اللہ۔

دنیا جانتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "رحمۃ للعالمین" ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ساری انسانیت کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کے لحاظ سے اہل اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ رحمۃ للعالمین کا پیغامِ رحمت ساری انسانیت تک پہنچائے جو کہ اس کے پاس انسانی برادری کی عظیم امانت ہے۔

اسی ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے اس کو "خیر امت" اور "امت وسط" اور "شھداء علی الناس" کا لقب عطا ہوا ہے اور افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کام اس امت سے اس وقت بالعموم چھوٹا ہوا ہے۔ کچھ افراد ہیں جو محدود پیمانے پر کسی حد تک یہ کام کر رہے ہیں لیکن بحیثیت امت اس فریضے کی طرف سے غفلت عام ہے۔

دعوتِ اسلام کے لیے بین الاقوامی طور پر حالات کی سازگاری

آج کے حالات اسلام کے لیے ایک سرسری نظر سے دیکھئے تو ناموافق ہیں، اس لیے کہ ہر طرف سے دنیا کی بڑی طاقتیں اسلام کے خلاف نبرد آزما نظر آ رہی ہیں، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ آج اسلام کے لیے حالات انتہائی سازگار ہیں، بقول شخصے مغربی دنیا "لا الٰہ" کا مرحلہ پار کر چکی ہے یعنی باطل خداؤں کی نفی کی منزل سے گزر چکی ہے اور یہی زیادہ سخت مرحلہ ہوتا ہے، اب اس کو بس إلا اللّٰه کا سبق پڑھنا باقی ہے، جدید سائنسی دور کی عقلیت پسندی اور سائنسی سوچ اسلام کے حق میں بہت سازگار اور مفید ثابت ہوئی ہے، اس نے خیالی اور توہماتی مذاہب سے ذہنوں کو ہٹا دیا ہے اور اسلام جیسے سائنٹیفک مذہب کے لیے فضا سازگار ہو گئی ہے، اور جو چیزیں کسی آسمانی مذہب کی نظر میں انتہائی جرم ہوتی ہیں یعنی

- تشکیک وریب، ہر نظریے اور خیال سے بے اطمینانی۔
- جنسی بے راہ روی۔
- ہر قید سے آزادی۔

مغرب ان تمام چیزوں کو ان کی انتہاؤں تک دیکھ کر اور برت کر فارغ ہو چکا ہے اور فطری قاعدہ ہے کہ ؎

إذَا تَمَّ شئٌ بـدَا نقصُـه
تَـرَقَّبْ زَوَالاً إذَا قِيْـلَ تَـمَّ

یعنی ہر شئ کی جب انتہا ہو جاتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے چنانچہ کہا گیا ہے ؎

ہر چیز کی ایک انتہا ہے
وہ جور کے بعد کیا کریں گے!

اس لیے ظاہر ہے تشکیک وریب کے بعد ایمان ویقین، جنسی بے راہ روی کے بعد راہ راست کی اہمیت اور بے قیدی اور آزادی کی انتہاء کے بعد کسی معقول فریم اور چوکھٹے میں محدود ہو جانے کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج تمام تر مخالفت ومزاحمت اور اعلیٰ ترین مادی وسائل سے لیس ہو کر اور انتہا درجے کی ذہانت وطبّاعی کے ساتھ وسیع پیمانے پر اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے باوجود اسلام انتہائی تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے اور مغرب میں بھی جہاں سب سے زیادہ اسلام کی مخالفت ہو رہی ہے خصوصاً امریکہ میں وہیں اسلام سب سے زیادہ مقبول ہو رہا ہے اور عریانی وفحاشی کی انتہا کو پہنچی ہوئی مغربی خاتون اسلام قبول کر کے مکمل حجاب میں امن محسوس کر رہی ہے اور مردوں سے بڑھ کر وہی اسلام کو گلے لگا رہی ہے۔ یہ اسلام کی مقبولیت کے وہ اسباب ہیں جو داعیانِ اسلام کی کسی کوشش کے بغیر قدرتی طور پر اسلام کی اپنی ذاتی کشش کی وجہ سے خود بخود پیدا ہوئے ہیں، لیکن ماحول کی اس سازگاری سے ہمارے لئے بے فکری اور اطمینان ومسرت کا موقع ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے لیے اپنی ذمہ داری سمجھنے کا خاص وقت ہے، حالات اگر خدانخواستہ ناسازگار ہوتے تو دعوت کا فریضہ تو اس وقت بھی ہمارے اوپر عائد تھا اور ہم اس کے لیے جوابدہ تھے۔

لیکن ان حالات میں ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا مواخذہ مزید سخت ہوگا کہ ؂

موسم اچھا پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!

ہمیں بڑی توجہ سے غور کرنا ہے کہ حالات کی اس سازگاری سے ہم کس طرح فائدہ اٹھائیں؟ اور داعیان اسلام کس طرح اپنے فریضۂ منصبی کو انجام دیں آئندہ سطروں میں ہم اسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۸ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ　　　　محمد عبداللہ طارق

دین و دعوت کے نقطۂ نظر سے

مسلمانوں کی قسمیں

مسلم قوم جس کا ہر فرد اپنے منصب کے لحاظ سے "داعی" ہے آج خود عملاً اسلام سے دور ہے بلکہ دنیا کو اسلام سے دور کرنے اور اسلام کی غلط نمائندگی کر کے دنیا کی قوموں کو اسلام سے نفرت دلانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، خود اسلام کی اپنی کشش جس حد تک دنیا والوں کو اسلام کی طرف لا رہی ہے خود اس کی راہ میں بھی ہم لوگ دیوار بنے ہوئے ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ ہم جب اپنے مسلمان بھائیوں کا اسلامی و دعوتی ذہن کے لحاظ سے تجزیہ کرتے ہیں تو وہ مجموعی طور پر چار قسم کے ہیں:

(۱) مسخ شدہ اور پوری طرح تبدیل شدہ ذہن جو غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے تیزاب میں ایک عرصے تک ڈوبا رہا اور جس کا ذہن مغرب کی بھٹیوں میں پگھل کر پوری طرح انہی کے مزاج میں ڈھل چکا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اسی انداز میں سوچتا اور اسی کے سُر میں سُر ملا کر بولتا ہے ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہوجائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اور یہ جو کچھ سوچتا، بولتا اور لکھتا ہے اس کے عوض اس کو کوئی مادی مفاد ہی ملنا ضروری نہیں بلکہ ذہن وفکر اور دل و دماغ کے یکسر تبدیل ہو جانے کے نتیجے میں اب وہی اس کی اپنی مخلصانہ اور حقیقی رائے ہے اور وہ بزعم خویش اپنی قوم مسلم کا مفاد واقعۃً اسی میں سمجھتا ہے۔

وہ چونکہ ایسے ہی ماحول میں پلا بڑھا ہے اور اس کے ذہن کا نشو ونما اسی ذہن کے لوگوں کے ذریعے ہوا ہے اس لئے چاہے اس کے ماں باپ مسلمان ہوں اور اس کا نام بھی مسلمانوں جیسا ہو لیکن وہ اندر اور باہر سے پوری طرح ''کالا انگریز'' ہو چکا ہوتا ہے، مسلمانوں سے اس کی ملاقات، اس کی تقریر، اس کی تحریر، اس کے ذریعے دی جانے والی تعلیم، اس کی نگرانی والی تعلیم گاہیں ادارے، ایسے ذہن کے لوگوں کے ذریعے چلنے والے حکومتی ادارے اور قومی فلاحی اسکیمیں سب کی سب سم قاتل اور ملت اسلامیہ کے لیے اور اس کی نئی نسل کے لیے زہر ہلاہل ہیں، ان کی ہوا تک دینی ذہن کے لیے موت ہے۔ ایسے لوگ ''ذہنی کوڑھ'' اور ''فکری جذام'' میں مبتلا ہیں؛ اور کوڑھ کے مریض کے متعلق ہمیں ہدایت نبوی ہے کہ فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ فِرَارَکَ مِنَ الْاَسَدِ (کوڑھی سے ایسے دور بھاگو جیسے تم شیر سے دور بھاگتے ہو)۔

(القاصد الحسنۃ للسخاوی رقم ۲۱ روالجامع الصغیر للسیوطی ۱/۱۳۷، ۱۳۸)

یہ انسانوں کی وہی قسم ہے جس کے متعلق ایک انگریز مفکر نے کہا تھا کہ ''ہمارا مقصد ان تعلیم گاہوں سے ہندوستان میں ایسے افراد تیار کرنا ہے جو بظاہر ہندوستانی ہوں لیکن ذہن وفکر کے لحاظ سے وہ پوری طرح انگریز ہوں''۔

چنانچہ ایک مسلمان، ایک ہندو ایک سکھ ایسی تعلیم گاہوں میں تعلیم پا کر جو کچھ پہلے تھا بظاہر وہ وہی بنا رہتا ہے لیکن اندر سے وہ مرتد ہو چکا ہوتا ہے جسے ہم ''ذہنی ارتداد'' کا نام دے سکتے ہیں اور اب حقیقت میں وہ: ع

مسلماں، نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

حقیقت میں اس کے اندرون کا ''قتل'' ہو چکا ہے جس کو اکبر الہ آبادی نے اس طرح

بیان کیا تھا ۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یاد رکھئے! مغربی تعلیم اور مغرب سے درآمد شدہ سائنس اور ٹکنالوجی تو دراصل مسلم سائنس دانوں ہی کے علوم کی ترقی یافتہ شکل اور عام انسانی علوم کے فطری ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے ھذہ بضاعتنا ردت الینا (یہ ہماری ہی دولت ہے جو پلٹ کر ہمارے پاس آگئی ہے) اور اس میں انسان کی مادی اور دنیاوی زندگی کی صلاح وفلاح مضمر ہے۔ اس سے گریز کرنا تو فطرت سے جنگ کرنے اور خودکشی کرنے کے مرادف ہے جو بڑی نادانی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مغرب کی پائپ لائن سے ہوکر جو چیز بھی آتی ہے اس میں مغرب کی لادینی تہذیب کے کانٹے ضرور شامل ہو جاتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس لادینی ملحد تہذیب کے کانٹوں سے بچتے ہوئے اس کے پھولوں اور پھلوں سے فائدہ اٹھایا جائے ۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ہمارے یہاں جو طبقہ "جدید ذہن" کا مانا جاتا ہے وہ سوء اتفاق سے عموماً مغرب کے پھول اور پھل کو کانٹوں سمیت قبول کرنا چاہتا ہے اور اسی کی وکالت کرتا ہے، دوسری طرف جو طبقہ "قدامت پسند" کہلاتا ہے وہ مغرب کی ہر چیز سے بلا استثنٰی نفرت کرتا ہے، وہ کانٹے تو کانٹے پھولوں کو بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں جبکہ راہ اعتدال اور طریق انصاف ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے ۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(۲) دوسرا طبقہ مسلمانوں میں "فروخت شدہ ذہن" کے لوگوں کا ہے، جن کا اپنا کوئی ذہن

نہیں بلکہ وہ وقتی مادی مفادات کے تحت کام کرتا ہے، ضرورت ہوتو وہ مغربی آقاؤں، بے دین ملکی دانشوروں کی وکالت بھی کر لیتا ہے، حکومت وقت کی ہر اچھی بری بات کی حمایت کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کو ملت اسلامیہ کی عزت و بے عزتی اور اسلام کی موافقت یا مخالفت سے بھی کوئی سروکار نہیں، اس کو ملت اسلامی اور ملی مفادات سے بھی کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

جب کسی شخص کی زندگی کے حالات سے اس کے بیانات سے تحریرات اور اس کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو جائے کہ یہ صرف اپنے مفادات کے پیچھے چلتا ہے تو اب اس کو کسی بھی اسلامی اور ملی معاملے میں ہرگز قابل اعتماد نہ سمجھا جائے ورنہ شرمندگی اور سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں، جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

ان لوگوں میں بھی دو قسم کے ذہن ہیں:

(الف) کھل کر دین سے بیزاری بلکہ بغاوت کا اعلان کر دینے والے جیسے رسوائے زمانہ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین وغیرہ، انکا معاملہ نسبتہً آسان ہے کہ ملت اسلامیہ عام طور پر ان سے متنفر ہو چکی ہے اور انکا ہوس ناموری میں ڈوب جانا، یا دولت کی غلامی میں پاگل ہو جانا، یا ''اسلام دشمن طاقتوں کی کٹھ پتلی'' بن جانا واضح ہو چکا ہے، یہ دورنگی چھوڑ کر پوری طرح اور صاف طور پر دشمن بن چکے ہیں۔

(ب) انہی فروخت شدہ ذہن کے لوگوں میں دوسرا طبقہ وہ ہے جو

- یا تو مصلحۃً
- یا اپنی کم ہمتی کے سبب

کھل کر اسلام بیزاری کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ''مار آستین'' (آستین کا سانپ) بن کر اسلام دشمنی کی مہم چلاتا ہے، ایسے لوگ دوست نما دشمن بن کر مسلم سماج میں گھسے رہتے ہیں اور خاموشی سے

نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، ان میں مغربی شکل ولباس والے بھی ہیں اور دینی شناخت اور دینی شکل ولباس والے بھی

یہ انہی کی سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی وملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ایسے مذہبی شناخت کے لوگوں کو قدیم علماء حقانی ''علماء سوء'' اور ''دنیا پرست علماء'' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔(1)

(۳) مسلمانوں میں تیسرا طبقہ وہ ہے جو خالی الذہن اور کسی بھی طرح کی مقصدیت سے خالی ہے، وہ صرف حیوانِ کاسب (کمانے والا جانور) ہے، جس کا مقصد کمانا کھانا عیش کرنا اور مکان جائداد بنانا ہے، جسے نہ اسلام کے مفاد سے دل چسپی ہے نہ اس کی بربادی کا کوئی غم، اس کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وقتی طور پر کسی بات سے متاثر ہو کر کسی دینی کام میں تعاون کر دینا وغیرہ الگ بات ہے، لیکن اسے کسی دینی معاملے سے حقیقی اور مستقل دل چسپی نہیں ہے، نہ وہ زیادہ سوچ فکر کرتا ہے ایسے لوگوں کو پہلی قسم کے یا دوسری قسم کے لوگ بہلا پھسلا کر اور عزت وشہرت کا سبز باغ دکھا کر غلط مقاصد کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور آئندہ چوتھی قسم کے لوگ ان کو اللہ رسول کا واسطہ دے کر اور ثواب بتا کر کسی اچھے دینی اور تعمیری کام میں استعمال کرنا چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔

دینی ذہن کے لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کرتے رہیں ان کے ذہن کی تربیت کرتے رہیں اور غلط لوگوں کے ہاتھوں ہی پھنسنے سے ان کو بچاتے رہیں۔

(۴) مسلمانوں کا چوتھا طبقہ وہ ہے جو دین دار کہلاتا ہے، جو ذہنی طور پر بھی مذہب کا پابند ہے اور وضع وشکل سے بھی مسلمان ہے ---- پھر یہ بھی دو قسم کے ہیں:

---

(۱) مصنف نے ایک دوسرے سیاق میں ایسے لوگوں کا تذکرہ اپنی کتاب ''امامت وخطابت اور اس کے تقاضے'' میں ص:۱۳۹تا۱۴۸تک تفصیل سے کیا ہے، اس پہلو کو مزید سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(الف) وہ لوگ جو نماز روزے کے پابند ہیں حلال وحرام کا خیال رکھتے ہیں، دینی کاموں میں عملی اور مالی تعاون بھی کرتے ہیں اور مذہبی رسوم واعمال کی پابندی کرتے ہیں اور بس اسی کو کافی سمجھ کر مطمئن ہیں۔

(ب) اس چوتھے طبقے میں دوسری قسم وہ ہے جو مذکورہ چیزوں کی خود پابندی کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کو ایک دینی نظام اور طریقۂ زندگی کے طور پر رائج کرنے اور زندگی کے ہر ہر شعبے میں اس کو جاری وساری کرنے کے لیے اور دنیا کے تمام باطل نظاموں کے مقابلے میں اسے ایک اعلیٰ نظام کے طور پر سربلند کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر کوشش کرتی ہے، اسلام کی ترقی اور سربلندی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا، وہی ان کی حسرت وآرزو اور وہی ان کے شب وروز کا مشغلہ اور دل کی امنگ ہے۔

یہی آخری قسم ہے جو اسلام دشمن طاقتوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ ان پر (فنڈا مینٹلسٹ) یعنی بنیاد پرست اور کٹر پنتھی وغیرہ کی پھبتی کستی رہتی ہیں، مغربی طاقتوں کی نظر میں یہی اصل کانٹا ہیں اور یہی وہ بندۂ مومن ہے جس کی بیداری سے ابلیسی طاقتیں ہر وقت لرزہ براندام رہتی ہیں ۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس ملت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتسابِ کائنات

مسلم طبقات کا یہ طویل تعارف کرانا اس لئے ضروری تھا کہ ہم آئندہ جو بات کہنا چاہتے ہیں اور جو قدم اٹھانے کی دعوت دے رہے ہیں ہمیں خود اپنے گھر کا حال معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کھوٹے سکے لے کر بازار میں نکل کھڑے ہوں یا زنگ خوردہ ہتھیاروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اتر جائیں۔

اس کتاب میں ہمارا تخاطب یوں تو سارے ہی مسلمانوں سے بلکہ جملہ نوع انسانی سے ہے لیکن اصلاً ہمارا روئے سخن آخری قسم کی طرف ہے اور اس کتاب میں جو درد پیش کیا گیا ہے اس کو اصلاً یہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کے لیے فکر مند ہو سکتے ہیں۔

نبیِ اکرم کی شانِ رحمت

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْن "ہم نے آپ کو۔ اے نبی اکرم!۔ اس طرح بھیجا ہے کہ آپ تمام دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہیں" (سورت ۲۱۔ آیت ۱۰۷)۔

دوسری جگہ فرمایا ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (یہ بس اللہ ہی کی رحمت ہے کہ آپ ان تمام لوگوں کے لیے نرم دل اور مہربان واقع ہوئے ہوئے ہیں) (۱۵۹/۳)۔

عربی زبان میں جو بات "ما" اور "اِلا" کے ساتھ بیان ہوتی ہے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ "بس یہ بات ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں" یعنی حصر کرنا اور احاطہ کرنا مراد ہوتا ہے کہ صرف اور صرف یہی بات ہے جسے ہم اردو میں "ہی" سے یا "بس یہی ہے" کے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کے لیے اور کائنات کے ہر وجود کے لیے سراپا رحمت و شفقت ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام عمر میں کبھی کسی بھی فرد بشر کو اپنا حریف اور دشمن نہیں سمجھا اور دشمن سمجھ بھی کیسے سکتے تھے، انسان ہی تو آپ کی دعوت کا مطلوب آپ کا مطمح نظر اور آپ کے مشن کا ہدف تھا، اسی کو اگر آپ حریف بنا لیتے تو کام کہاں کرتے؟ انہی سنگ ریزوں کو تو تراش تراش کر نگینہ بنانا تھا، انہی مُردوں

میں تو حق وصداقت کی روح پھونک کر زندہ کرنا تھا ۔

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اگر کوئی مسیحا لاشوں سے نفرت کرنے لگے تو اپنی مسیحائی کہاں دکھائے گا؟

اگر کوئی سرجن گلے سڑے زخموں سے گھن کرنے لگے تو اپنی سرجری کے جوہر کہاں نمایاں کرے گا؟

اگر کوئی فائر بریگیڈ (Fire Brigade) کا عملہ آگ کے شعلوں سے دور بھاگنے لگے تو اپنی ڈیوٹی اور اپنا فرض منصبی وہ کہاں انجام دے گا؟

ماں باپ اگر بچوں کے پیشاب پاخانے سے بچنے لگیں ان کی ضد اور رونے چلانے سے تنگ ہونے اور گھبرانے لگیں تو انہیں کس کے حوالہ کریں گے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رشتہ تمام دنیا کے انسانوں کے ساتھ ٹھیک یہی ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِہٖ (میں تمہارے لیے ایسے ہوں جیسے ایک باپ اپنی اولاد کے لیے ہوتا ہے)۔(احمد، ابوداود، نسائی وسندہ حسن وابن ماجہ والدارمي وابن حبان وابوعوانۃ في صحیحہ عن ابي ہریرۃ)

اللہ تعالیٰ نے بھی جس انداز اور جس معنوی وسعت میں خود کو رب العالمین فرمایا ہے اسی انداز اور اسی معنوی وسعت کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین فرمایا ہے۔

آپ جب خالق کون ومکان کی ''وسعت ربوبیت'' پر غور کریں گے تو اندازہ ہوگا کہ تمام زمینی اور آسمانی مخلوق، تمام نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی مخلوق، ماضی میں جو مخلوق تھی، حال میں جو مخلوق ہے اور آئندہ کبھی بھی جو مخلوق پیدا ہوگی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب کا رب اور پالنہار ہے اور جس جس مخلوق کا اللہ تعالیٰ رب ہے اسی اسی مخلوق کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی رحمت ورأفت ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ اپنی شانِ ربوبیت کا تعلق کسی بڑی سے بڑی مخلوق یا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق سے ختم کردے تو وہ ایک لمحے بھی باقی نہیں رہ سکتی، کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پیدا ہونے میں اللہ کی خالقیت کا اور اپنے برقرار رہنے میں اس کی رحمت و ربوبیت (اور اس کی پرورش) کا محتاج ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ، ہر پسندیدہ اور ناپسندیدہ مخلوق، ہر فرماں بردار اور ہر نافرمان بندہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت سے فیض پا رہا ہے اور جو مخلوق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے فیض یاب ہے وہ تمام کی تمام مخلوق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کی بھی حقدار و سزاوار ہے چاہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند کرے یا نہ کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے دلچسپی رکھے یا نہ رکھے بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت میں اس کا حصہ برقرار ہے اس کی کسی سرکشی، کسی تمرد وطغیان، کسی اسلام دشمنی، کسی تکبر و غرور اور کسی فرعونیت کی وجہ سے رحمتِ نبوی میں سے اس کا کوٹا (Quota) ختم نہیں ہوجاتا۔

آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا اور ہر چند کہ اللہ تعالیٰ اس کے انجام سے پوری طرح باخبر تھا لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اسکے پاس بھیجتے وقت بتایا گیا کہ اِنَّه طغیٰ (وہ سرکش ہوگیا ہے) اور حالت اس کی یہ تھی کہ وہ صرف خود گمراہ نہ تھا بلکہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق واَضَلَّ فرعونُ قومَه وَمَا هدیٰ (اس نے اپنی قوم کو بھی گمراہ کیا تھا، ان کی صحیح رہنمائی نہیں کرتا تھا)۔ (سورۃ ۲۰، آیت ۷۹)

لیکن اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بھائیوں کو "پیغام ہدایت کے قبول ہوجانے" کی امید دلا کر بھیجا تھا چنانچہ ارشاد فرمایا تھا فقولا له قولاً لیناً لعله یتذکر او یخشیٰ "اس سے تم دونوں نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت کو مان جائے اور اللہ سے ڈر جائے"۔ (سورت مذکورہ آیت ۴۴)

اس آیت کی واضح تعلیم یہ ہے کہ مدعو خواہ کتنا ہی سرکش اور کتنا ہی سخت درجے کا گمراہ اور گمراہ ہی نہیں بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے والوں کا سرغنہ کیوں نہ ہو داعی کو لازم ہے کہ:

۱۔شفقت ومہربانی سے لبریز نرم گفتگو کرے۔

۲۔اس کے راہِ راست پر آنے کے لیے پرامیدرہے کہ میری دعوت رائگاں نہیں جائے گی۔

۳۔اللہ کی بھرپور تائید ونصرت کا یقین رکھے۔

۴۔اور ماحول خواہ کتنا ہی مخالف اور سخت مزاحم کیوں نہ ہو ہرگز خوف زدہ نہ ہو اور یقین رکھے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔قال لا تخافا اِنني مَعَكُما اَسْمَعُ وَاَرَى (اے موسیٰ اور ہارون خوف نہ کھانا میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سب کچھ سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں)(۲۰/۴۶)۔

نبی کی رحمت اللہ کی رحمت کا پرتو ہے

جیسا کہ اوپر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ آپ ان کیلئے نرم دل اور مہربان واقع ہوئے ہیں، اگر آپ تیز مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے (۳/۱۵۹)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بیان فرمائی ہے کہ میں بطش شدید کا مالک بھی ہوں، میں زبردست انتقام بھی لیتا ہوں، میں جلال وجبروت بھی رکھتا ہوں عذ ابی اُصِيْبُ به مَنْ اَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيءٍ ''میں اپنی سزائیں تو جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے'' (۷/۱۵۶)۔

اور حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِيْ ''میرے غصے سے میری رحمت بڑھی ہوئی ہے'' (مسلم عن ابی ہریرۃؓ)۔

بخاری ومسلم کی روایت ہے حضرت ابو ہریرۃؓ بیان فرماتے ہیں میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کرنے سے بھی پہلے ایک تحریر لکھی تھی اس میں لکھا تھا کہ اِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي، فَهُوَ مَكْتُوْبٌ عِنْدَهُ فَوقَ الْعَرْشِ ''یقیناً میری رحمت میرے غصے سے بڑھی ہوئی ہے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے یہاں عرش کے اوپر لکھی ہوئی ہے''

(مشکوٰۃ رقم ۵۷۰۰)۔

دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کرتے وقت اپنے ذمے یہ لکھ لیا تھا اِنَّ رحمتی تغلِبُ غضبی "بلاشبہ میری رحمت میرے غصے پر غالب رہے گی" (ترمذی، ابن ماجہ عن ابی ہریرۃؓ، الجامع الصغیر ۲۵۸/۲)۔

یہی شان اس نے اپنے آخری اور کائناتی نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں رکھی ہے کہ آپ کو اپنی ذات کے لیے زندگی میں کبھی ایک بار بھی غصہ نہیں آیا بلکہ جتنی زیادہ آپ کی شان میں گستاخی کی جاتی اس ابرِ کرم سے اتنی ہی زیادہ رحمت برستی تھی۔

آپ کی بلند اخلاقی کا ایک خاص واقعہ

یہاں معجم کبیر طبرانی سے ایک واقعہ نقل کرنا ضروری ہے، مدینے کے ایک بڑے اسرائیلی (یہودی) عالم زید بن سُعْنَہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر میری اولیں نظر پڑی تھی تو جس قدر بھی نشانیاں توریت میں اس آخری نبی کی بتائی گئی تھیں وہ سب مجھے نظر آ گئی تھیں، صرف دو باتیں باقی تھیں جن کو میں نہیں جان سکا تھا:

۱- ایک یہ کہ یَسْبِقُ حِلْمُہٗ جَھْلَہٗ ان کی برداشت ان کے غصے پر حاوی ہوگی۔

۲- اور دوسری یہ کہ ولا تزیدہ شدۃ الْجَھْلِ عَلَیْہِ اِلاَّ حِلْمًا۔

"کوئی ان کے ساتھ جتنی زیادہ جہالت و بدتمیزی کرے گا ان کی برداشت اور ان کا حلم اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا"۔ (ظاہر ہے یہ بات چہرہ دیکھنے اور کوئی دو چار منٹ کی عام سی ملاقات میں نہیں ظاہر ہوسکتی تھی چنانچہ انہوں نے اس کے لیے ایک تدبیر سوچ لی اور اس کو انجام دینے کیلئے موقع کی تلاش میں رہے اور آخر وہ موقع مل گیا)۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلے، ساتھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تھے، اتنے میں ایک دیہاتی اونٹ پر سوار آیا اور عرض کی کہ "اللہ کے رسول! میرے کچھ لوگ فلاں گاؤں میں ہیں وہ اسلام قبول کر چکے ہیں، میں نے ان سے کہا تھا کہ تم اگر

اسلام قبول کرلو تو اللہ تعالیٰ تمہیں خوب کشادہ روزی دے گا، لیکن اس وقت وہ بارش کی کمی اور قحط سالی کا شکار ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ جیسے وہ لالچ میں اسلام لائے تھے اسی طرح کہیں (بددل ہوکر) اسلام سے نکل نہ جائیں، اس لیے اگر ہو سکے تو آپ ان کی مدد کے لیے کچھ کر دیجئے!

زیدؓ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برابر میں کھڑے ایک اپنے ساتھی پر نظر ڈالی جو شاید حضرت علیؓ ہی تھے (جیسے آپ کسی رکھے ہوئے مال کے متعلق جاننا چاہتے ہوں) چنانچہ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول! اس میں سے تو کچھ نہیں بچا ہے! زیدؓ کہتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا اور میں نے عرض کیا کہ:

”محمد! آپ اتنی کھجوریں فلاں کے باغ کی اتنی مدت کے وعدے پر بیچتے ہیں؟ (یعنی رقم میں اب دیے دیتا ہوں کھجوریں بعد میں لے لوں گا) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (کھجوریں دینا تو منظور ہے لیکن) کسی کے مخصوص باغ کی شرط مناسب نہیں! زیدؓ نے منظور کرلیا اور اپنی ہمیانی میں سے نکال کر اسی مثقال (سوا سو درہم کے قریب کے) سونے کے سکے حضور اکرم کو دیدیئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ (تمام کے تمام) ان صاحب کو دیدیئے اور فرمایا یہ لیجا کر ان کے درمیان تقسیم کردو اور ان کی مدد کرو۔

زیدؓ کہتے ہیں کہ ابھی اس وعدے میں دو تین دن باقی تھے کہ میں نے دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور متعدد صحابہ کرامؓ کے ہمراہ تشریف لے جارہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازے کی نماز پڑھائی اس سے فارغ ہوکر ایک دیوار کے سائے میں بیٹھنا چاہتے ہی تھے کہ میں آپ کے پاس پہنچا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان چادر سمیت پکڑ لیا اور بہت غضب آلود چہرے سے ان کی طرف دیکھا اور میں نے کہا ”محمد! میرا حق نہیں دوگے تم؟ خدا کی قسم!

میں نے عبدالمطلب کے خاندان میں ٹال مٹول کے سوا کچھ نہیں پایا، مجھے تم لوگوں کی عادت پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی"۔

زیدؓ کہتے ہیں کہ میں (کنکھیوں سے) عمرؓ کو دیکھ رہا تھا ان کی آنکھیں غصے سے مسلسل گردش میں تھیں، پھر انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا: اللہ کے دشمن! تو یہ کیا بک رہا ہے؟ اور میرے سامنے تیری یہ مجال؟ میں کچھ سوچ کے چپ ہوں ورنہ اپنی تلوار سے تیرا سر الگ کر دیتا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے سکون واطمینان سے میری طرف دیکھ رہے تھے"۔

زیدؓ کہتے ہیں: اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عمر! میرے اور ان کے معاملے میں تمہارا رویہ کچھ اور ہونا چاہیے تھا، مجھے تو تم بہتر ادائیگی کی تلقین کرتے اور ان کو حسنِ مطالبہ کی، عمر! اب تم ان کو لے جاؤ اور ان کا حق ادا کر دو اور (خاموشی سے) یہ بھی ہدایت فرمائی کہ ان کو بیس صاع (تقریباً ایک کوئنٹل) بڑھا کر دینا، اس بات کے بدلے کہ تم نے ان کو دھمکی دے کر خوفزدہ کیا ہے۔

زیدؓ کہتے ہیں عمرؓ مجھے لے کر چلے اور مجھے میرا حق دیدیا اور بیس صاع کھجوریں مزید دیں، میں نے کہا عمرؓ یہ اضافہ کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ان کو بیس صاع بڑھا کر دینا اس بات کے بدلے کہ تم نے ان کو خوفزدہ کیا ہے۔

زیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: عمر! آپ مجھے جانتے ہیں میں کون ہوں؟

حضرت عمرؓ: نہیں!

زیدؓ: میں زید بن سُعْنَہ ہوں!

حضرت عمرؓ: وہ حَبر؟ (ممتاز یہودی عالم؟)

زیدؓ: ہاں حَبر!

حضرت عمرؓ: تو تمہیں یہ کیا سوجھی تھی جو یہ حرکتیں تم نے حضور اکرم کی شان میں کیں؟

زیدؓ: عمر!: (بات اصل یہ تھی کہ) جتنی بھی علامتیں نبوت کی تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کو دیکھ کر وہ سب کی سب آپ کے اندر مجھے نظر آ گئی تھیں سوائے دو باتوں کے، ان کو میں نہیں جان سکا تھا:

۱- ان کی برداشت ان کے غصے پر غالب رہے گی۔

۲- کسی جاہل اور بدتمیز کی جہالت جتنی بھی بڑھے گی ان کی برداشت اور سمائی اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی۔

ان دو باتوں کی جانچ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اب میں نے یہ دونوں باتیں بھی دیکھ لیں، اب میں عمرؓ آپ کو گواہ بنا کر اقرار کرتا ہوں کہ

۱- میں راضی ہوں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر۔

۲- اور اسلام کے دین و مذہب ہونے پر۔

۳- اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر۔

۴- اور میں اس بات پر بھی آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا آدھا مال- جبکہ میں مدینہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر صدقہ ہے۔

عمرؓ: یا (یوں کہہ لو کہ) ان کے کچھ لوگوں پر، اس لیے کہ سب کو تو تم دے نہیں سکتے!

زیدؓ: (ٹھیک ہے) حضور کی امت کے کچھ لوگوں پر۔

اس کے بعد یہ دونوں حضرات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور حضرت زیدؓ نے وہاں پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہا اَشھد اَن لاالہ الا اللہ واَشھد اَن محمداً عبدہ ورسولہ.

راوی کا بیان ہے کہ پھر وہ پوری طرح مومن ثابت ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور تمام معرکوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شریک رہے اور غزوۂ تبوک سن ۹ ھ میں لڑتے ہوئے اس طرح شہید ہوئے کہ آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے پیٹھ نہیں دکھائی

اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔(حیاۃ الصحابۃ عربی بتحقیق محمد عبداللہ طارق ۲۱۳/۱، بحوالہ مجمع الزوائد ۲۴۰/۸، والاصابۃ ۵۶۶/۱، ودلائل النبوۃ ص:۲۳)

فتح وکامرانی کے اعلیٰ مقام پر پہنچ کر بھی عام شفقت ومہربانی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی مہم جس وقت جاری ہے اور ملکی سطح پر فتح وشکست کا فیصلہ ابھی باقی ہے اور علاقے پر مکمل قوت اور کامل اقتدار کا مرحلہ ابھی دور ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے وقت پر غصہ دکھانا اور انتقامی کارروائی کرنا دانشمندی نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن سُعنہ جیسے بااثر اور دولت مند یہودی عالم سے ٹکرانا مناسب نہ سمجھا ہو، گویا (نعوذ باللہ) یہ پیغمبرانہ عالی ظرفی نہیں بلکہ قائدانہ دوراندیشی اور سیاسی حکمت عملی تھی، لیکن یہ سوچنا درست نہیں، پہلی بات تو یہی ہے کہ اس یہودی عالم کی یہ تمام کارروائی دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کا امتحان تھا اور اس نے مشاہدہ کرلیا تھا کہ توریت میں جو صفتیں اس آخری نبی کی بتائی گئی ہیں وہ سب بدرجۂ تمام وکمال ان کے اندر موجود ہیں بس ان دو باتوں کا جانچنا رہ گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرام ان صاحب کو جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ کون اور کس حیثیت کا مالک ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کی اور ان کی بات چیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی مہم جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی، مکہ فتح ہو چکا تھا، سوا لاکھ جاں نثاروں کی فوج آپ کے اشاروں پر جان دینے کو تیار تھی اور پورا عرب آپ کے زیر قدم آچکا تھا اس وقت بھی آپ کے اخلاق کریمانہ میں کوئی کمی تو کیا آتی، اور آپ کسی سے کوئی انتقامی کارروائی تو کیا کرتے آپ کی شفقت ومہربانی اور آپ کا کرم بام عروج پر تھا، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی کی انتہا کردی تھی، خاندانی تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا، جنھوں نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دینے کی قسمیں کھائی تھیں وہ ڈر رہے تھے کہ آج محمد کو سارے عرب پر زبردست طاقت حاصل ہوگئی ہے اور

اب ہماری خیر نہیں لیکن آپؐ نے خود ہی ان کو بلوایا اور ان کو ان کے وہم و گمان سے ماسوا بخشش و محبت سے نوازا۔

مشہور مؤرخ ابن عساکر نے حضرت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا کہ صفوان بن امیہ، ابوسفیان بن حرب اور حارث بن ہشام کو بلا کے لاؤ، میں بلا کر لایا اور دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آج اللہ تعالیٰ نے ان (دشمنوں) پر ہمیں قابو دیا ہے اب میں ان کو اچھی طرح مزہ چکھاؤں گا۔

لیکن یہ لوگ جب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری اور تمہاری مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی سی ہے، (مصر کا تخت و تاج پانے کے بعد جب ان کے بھائی ان کے پاس پہنچے تھے تو) انہوں نے ان سے کہا تھا (جیسا کہ قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے کہ) لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ، وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ''تمہارے اوپر آج کوئی گرفت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے؛ وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے'' (کنز العمال ۵/۲۹۴)۔

دوسری روایتوں میں ہے کہ مکہ فتح ہونے کے بعد آپ کعبۃ اللہ شریف میں تشریف لے گئے وہاں سے جب نکلے تو کعبے کی چوکھٹ دونوں طرف سے پکڑ کر کھڑے ہوئے اور مکہ والوں سے پوچھا: آج تم کیا کہتے ہو اور مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟

سہیل بن عمرو قریشی (جو قریش کے مانے ہوئے خطیب اور قادر الکلام ترجمان تھے) نے جواب دیا کہ ہم آپ سے خیر کی ہی امید رکھتے ہیں آپ شریف بھائی ہیں اور شریف باپ کے بیٹے ہیں اور اس وقت آپ برتر حالت میں ہیں (اور شریف انسان کو جب برتری حاصل ہوتی ہے تو وہ اور بھی زیادہ شریف ہو جاتا ہے) آپ بڑے رحم دل بھی ہیں اور بڑے بردبار بھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تمہارے اوپر کوئی داروگیر کوئی گرفت نہیں اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ ''جاؤ تم سب آزاد ہو'' ---- راوی کا بیان ہے کہ وہاں سے وہ اس طرح اٹھ کر

چلے جیسے قبروں سے زندہ ہو کر پھیل پڑے ہوں اور پھر وہ سب جلد یا بدیر اسلام میں داخل ہو گئے۔
(بیہقی ۹/۱۱۸، اصابہ ۲/۹۲، بحوالہ حیاۃ الصحابہ تحقیق محمد عبداللہ طارق ۱/۲۵۶ تا ۲۵۸)

انتہائی دشمنوں کے ساتھ بھی اعلیٰ درجے کی مہربانی

مکہ فتح ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام معافی کے اعلان کے باوجود کچھ لوگ وہ تھے جو اسلام دشمنی میں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وجور اور سازشوں میں انتہا سے گزرے ہوئے تھے انہوں نے غالباً خود ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ عام معافی اپنی جگہ لیکن ہمارا معاملہ عمومی نہیں ہے ہمیں تو کسی طرح چھوڑا ہی نہیں جا سکتا اس لیے ملک چھوڑ دینے کے علاوہ ان کو کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ ابرِ کرم کہاں کہاں اور کس حد تک برس رہا ہے۔

ہم یہاں نمونے کے لیے صرف چند ان لوگوں کا حال لکھتے ہیں جو اسلام دشمنی میں تمام حدوں کو پار کیے ہوئے تھے اور اپنی جان بخشی کے ہر امکان سے ناامید تھے، آپ دیکھئے کہ رحمت عالم نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا:

(۱) عکرمہؓ بن ابوجہل، فرار اور واپسی

جس دن مکہ فتح ہوا عکرمہ یمن کی طرف فرار ہو گئے تھے لیکن ان کی اہلیہ ام حکیم بنت الحارث نے اسلام قبول کر لیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! عکرمہ آپ سے بچ کے یمن بھاگ گئے ہیں انہیں ڈر ہے کہ آپ ان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑیں گے، آپ ان کو امن دیدیجئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عکرمہ کو امن ہے“ وہ عکرمہ کی تلاش میں ساحل کی طرف نکلیں اور آخر تہامہ کے ایک ساحل پر ان کو پا لیا اور واپسی کے لیے اصرار کیا وہ کسی طرح تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نادان اور فریب خوردہ عورت انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہی ہے۔ لیکن وہ اڑی رہیں اور انہوں نے کہا کہ میں ایک نہایت صلہ رحمی کرنے والے، نہایت نیک دل اور تمام لوگوں میں سے بہترین انسان کے پاس سے آئی ہوں، تم خود کو

برباد مت کرو، میرے ساتھ واپس چلو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے لیے جان بخشی کرالی ہے! عکرمہؓ نے پوچھا کیا واقعی ایسا تم نے کرلیا ہے؟ وہ بولی ہاں، میں نے ان سے بات کی تھی انہوں نے تمہیں امن دیدیا ہے چنانچہ وہ واپس آگئے۔

ام حکیمؓ کی پختگی ایمان کا ایک واقعہ

واپسی کے سفر کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے عکرمہ کے ذہن وخیال کی دنیا میں سوچ فکر اور سوالوں کی ایک کہکشاں جگمگا دی، کسی منزل پر سکون اور تنہائی کے وقت عکرمہ نے اپنی اہلیہ سے اپنی جنسی طلب کا اظہار کیا، فدا کار و وفا شعار اہلیہ جو جان پر کھیل کر اور لمبے خطرناک راستوں سے تنہا عورت ذات شوہر کو واپس لائی تھی اس نے جواب دیا: ''یہ نہیں ہوسکتا! تم کافر ہو اور میں مسلمان ہوں'' عکرمہ کو انتہائی حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا: اِنَّ أمْرًا مَنَعَكِ مِنِّي لأمْرٌ كَبِيْر (یقیناً جو چیز تمہیں اور مجھ سے روک دے! بہت ہی بڑی چیز ہے!!) یہ واقعہ اس بات کی بہت بڑی شہادت ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں ایمان گھر کر جاتا ہے تو وہ کسی تنہا سے تنہا مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی سرحدوں کو پامال نہیں ہونے دیتا۔ اس مومنہ کے اس جملے نے یقیناً عکرمہ کو اندر سے جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور پختگیِ ایمان اور مضبوطیِ کردار کی ایک میخ عکرمہ کے دل میں گاڑ دی۔

احترامِ انسانیت کا اعلیٰ نمونہ

یہاں درمیان میں ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ پیشین گوئی کے علاوہ آپ کی طرف سے ناموسِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کا اعلیٰ نمونہ ہے

آدمیت احترام آدمی

باخبر شو از مقام آدمی

ابھی عکرمہ شہر مکہ سے خاصی دوری پر ہی تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرامؓ سے فرمایا کہ عکرمہ تمہارے پاس مومن بن کر اور مہاجرانہ شان سے آرہے ہیں تم ان کے

والد کو برا مت کہنا، مُردوں کو برا کہنے سے وہ برائی تو ان کو پہنچتی نہیں لیکن ان کے زندہ (اہل خاندان اور رشتے داروں) کو اس بات سے تکلیف پہنچتی ہے۔

جب عکرمہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچے اور آپ کی نظر ان پر پڑی تو آپ انتہائی خوشی میں اس تیزی سے ان کی طرف لپکے کہ آپ کے کاندھوں سے چادر مبارک نیچے گر پڑی، پھر آپ بیٹھ گئے عکرمہ بھی بیٹھ گئے، عکرمہ کی اہلیہ بھی پاس بیٹھ گئیں، عکرمہ نے کہا: محمد! اس کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے مجھے امن دیدیا ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: یہ سچ کہتی ہیں تمہیں امن ہے!

عکرمہ دامنِ رحمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں

عکرمہ: محمد! آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور یہ یہ کرو آپ نے متعدد اسلامی اعمال تعلیم فرمائے۔

عکرمہ: اللہ کی قسم! یہ سب باتیں تو حق ہیں اور اچھی بہترین باتیں ہیں، اللہ کی قسم! آپ جن باتوں کی دعوت دے رہے ہیں اس دعوت سے پہلے بھی آپ ہمارے درمیان بات کے سچے اور سب سے زیادہ نیکی کرنے والے انسان تھے۔

اس کے بعد عکرمہ نے کہا اشھد ان لاالٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ — حضور اکرم صلی اللہ علیہ اس بات سے نہایت خوش ہوئے۔

پھر عکرمہ نے کہا: اللہ کے رسول! مجھے بتائیے میں سب سے اچھی بات کیا کہوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو اشھد ان لاالٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ.

عکرمہ: پھر اس کے بعد کیا؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: تم یہ کہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں اور تمام حاضرین محفل

کو گواہ بناتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، مجاہد ہوں، مہاجر ہوں۔

عکرمہ نے ان باتوں کا اسی طرح اقرار کیا۔ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں یہ باتیں کہتا جا رہا تھا لیکن شرم سے میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: عکرمہ آج تم مجھ سے جس چیز کا بھی سوال کرو گے جو میں نے کسی اور کو دی ہو تمہیں بھی دوں گا۔

عکرمہ: میرا سوال آپ سے بس یہی ہے کہ آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، میری:

- ان تمام کوششوں کے لیے جو فساد اور بگاڑ کے لیے میں نے کی ہیں!
- ان تمام مواقع کے لیے جب میں نے آپ کا سامنا کیا ہے!
- ان تمام باتوں کے لیے جو میں نے آپ سے منھ در منھ کی ہیں!
- یا آپ کی پیٹھ پیچھے کی ہیں!

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت (ہاتھ اٹھائے اور) دعاء فرمائی اے اللہ!

۱-ان کی ہر اس دشمنی کو بخشدے جو انہوں نے میرے ساتھ کی ہو۔

۲-ان کی ہر اس کوشش کو بھی بخشدے جو انہوں نے تیرے نور (کی شمع) بجھا دینے کیلئے کی ہو۔

۳-ان کی ہر اس (غلطی) کو بھی بخشدے جو انہوں نے میرے سامنے میری بے عزتی کرنے کے لیے کی ہو۔

۴-یا میری غیر موجودگی میں کوئی ایسی غلطی کی ہو۔

عکرمہ: اللہ کے رسول! میرا دل خوش ہو گیا!

پھر عکرمہ نے کہا: اللہ کے رسول! میں اللہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں:

- میں نے اب تک جو بھی کچھ رقم اللہ کی راہوں کو مسدود کرنے اور خدا کے دین کو روکنے میں خرچ کی ہے اس سے کئی گنا راہ خدا کو فروغ دینے میں خرچ کروں گا۔
- اور جو جنگیں میں نے راہ خدا کے خلاف لڑی ہیں ان سے کئی گنا راہ خدا میں اسلام کی ترقی

کے لیے قربانی دوں گا۔

عکرمہ نے اپنے پرانے ساتھیوں کے سامنے اقرار کیا کہ خدا کی قسم! ہم لوگ اپنی صلاحیتیں فضول برباد کر رہے تھے حالانکہ ہماری عقلیں اس وقت بھی ہمارے پاس تھیں لیکن ہم پتھروں کی بندگی میں پڑے ہوئے تھے جو نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور واقعی عکرمہؓ نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ (کنز العمال ۷/۷۵، المستدرک ۳/۲٤۱، مجمع الزوائد ٦/۱۷٤، الاصابة ۲/٤۹٦)

(۲) صفوانؓ بن امیہ، فرار اور واپسی

صفوان بن امیہ کے اسلام کا قصہ بھی کچھ اسی طرح کا ہوا کہ فتح مکہ کے دن ان کی اہلیہ بغومؓ بنت معذل نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن یہ اپنی جان بچا کر ملک چھوڑ دینے کے ارادے سے بحری جہاز پکڑنے چلے گئے تھے، ان کے ساتھ اس وقت صرف ان کا غلام یسار تھا، انہوں نے دور سے کوئی سایہ اپنی طرف آتے دیکھا تو یسار سے کہا کہ ترا بھلا ہو دیکھ تو یہ کوئی (ہمارا پیچھا کر رہا) ہے؟ یسار نے کہا یہ تو عمیر بن وہبؓ ہیں! صفوان نے کہا میں اب اس کا کیا کروں یہ تو لازماً مجھے قتل کرنے ہی آ رہا ہے! مجھے چھوڑ کر محمد کا ساتھ دیدیا اور اس سے جا ملا (اور اب میری جان لینے آیا ہے)۔

قصہ یہ ہوا تھا کہ عُمیرؓ اور صفوانؓ دونوں چچا تائے کے بھائی تھے انہوں نے اسلام لانے سے قبل ایک انتہائی خفیہ معاہدہ کیا تھا حضرت عمیرؓ پر کچھ قرضہ تھا انہوں نے کہا کہ میرے قرضے کا اور بچوں کی کفالت کا انتظام ہو جائے تو میں مدینہ جا کر دھوکے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دوں، صفوان نے دونوں باتوں کی ذمہ داری لے لی اور کہا کہ تم جاؤ یہ کام کرو دیکھو کانوں کان اس منصوبے کی کسی کو بھنک نہ لگنے دو، یہ مدینہ پہنچے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پوری سازش ہو بہو ان کے سامنے کھول کے رکھدی، آپ کی بات کا سننا تھا کہ انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

صفوان اور یسار کی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں حضرت عمیرؓ ان کے پاس پہنچ گئے، صفوان نے عمیرؓ سے کہا: اتنا سب کچھ تمہارے لیے کافی نہیں ہے جو اب تک تم میرے ساتھ

کر چکے ہو؟ اپنے قرض کا بوجھ مجھ پر لاد گئے، اپنے بیوی بچوں کی کفالت میرے اوپر ڈال دی اور اب میرے قتل کے لیے آئے ہو؟

حضرت عمیرؓ نے فرمایا: ابو وہب! میری جان تم پر نثار، میں ایک انتہائی نیک اور تمام دنیا سے بڑھ کر ہمدردانہ سلوک کرنے والے انسان کے پاس سے آرہا ہوں، حضرت عمیرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ یا رسول اللہ! میری قوم کا سردار بھاگ کر چلا گیا ہے تاکہ سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے، اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ آپ اسے بخشیں گے نہیں، میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ اس کو امان دیدیں!

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اسے امان دیتا ہوں حضرت عمیرؓ نے جب یہ خوش خبری ان کو سنائی تو ان کو یقین نہیں آیا اور انہوں نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم میں اس وقت تک تمہارا یقین نہیں کروں گا جب تک کہ کوئی نشانی (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) نہ لے آؤ جسے دیکھ کر میں یقین کرلوں۔

یہ واپس گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صفوان کی بے اطمینانی کا ذکر کیا، رحمت عالم تو ہر طرح ان کو اپنے دامن کرم میں لینے کے لیے خود ہی بے چین تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا کہ لو میرا یہ عمامہ (صافہ) لیجاؤ، یہ ایک دھاری دار یمنی کپڑا تھا جسے سر پر باندھے چہرے پر اس کا ایک سرا ڈالے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامۂ مبارک لے کر عمیرؓ دوبارہ صفوان کو لانے کے لیے نکلے اور ان سے ملے اور ان سے کہا کہ ابو وہب! میں تمہارے پاس ایک سب سے بہتر انسان کے پاس سے، سب سے زیادہ رشتوں ناتوں کا خیال رکھنے والے، سب سے بڑھ کر نیک، سب سے بڑھ کر بردبار و حلیم انسان کے پاس سے آرہا ہوں جس کی ماں تیری ماں اور جس کا باپ تیرا باپ ہے اس کی عزت تیری عزت ہے اس کی عظمت تیری عظمت ہے اس کا اقتدار تیرا اقتدار ہے میں

تیرے دل میں اللہ کی یاد جگانا چاہتا ہوں۔

صفوان نے کہا مجھے اپنے قتل ہوجانے کا خوف ہے، حضرت عمیرؓ نے کہا وہ آپ کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دینے کے لیے بلا رہے ہیں اگر تم خوشی سے اسلام قبول کرو گے تو تمہاری مرضی ہے ورنہ دو مہینے تمہیں آزادی ہوگی اور وہ انسان (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے زیادہ سچے اور وعدے کے انتہائی پکے ہیں (آپ سے جو کچھ کہیں گے لازماً وہی کریں گے)۔

انہوں نے آپ کے پاس اپنی وہ چادر بھیجی ہے جسے سر پر لپیٹے چہرے پر ڈالے آپ (مکہ مکرمہ میں) داخل ہوئے تھے لو ذرا پہچانو تو! انہوں نے دیکھ کر کہا ہاں بالکل! یہ وہی ہے۔

چنانچہ صفوان روانہ ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں عصر کی نماز پڑھا رہے ہیں، یہ دونوں انتظار کرنے لگے، صفوان نے پوچھا: دن رات میں یہ لوگ کتنی نمازیں پڑھتے ہیں؟ حضرت عمیرؓ نے فرمایا: پانچ، پوچھا: نماز محمد ہی پڑھاتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، جیسے ہی آپ صلی اللہ نے سلام پھیرا خوف زدہ صفوان چیخے کہ محمد! عمیر بن وہب آپ کی چادر دکھا کر مجھے لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی ہے، اور یہ کہ اگر میں خوشی سے اسلام قبول کروں تو ٹھیک ورنہ مجھے دو مہینے کی آزادی ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ابو وہب آجاؤ (تم باعزت ہو مہمان ہو) صفوان نے کہا نہیں آپ مجھے صاف صاف بتایئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں دو مہینے کی نہیں چار مہینے کی آزادی ہے (خوب سوچ سمجھ لو) اس پر یہ آگئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوازن کا سفر درپیش تھا صفوان بھی آپ کے ساتھ نکلے جبکہ ابھی انہوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا، (ان کے پاس جنگی سامان کافی مقدار میں جمع تھا) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سے کچھ زرہیں مستعار مانگیں، انہوں نے سو زرہیں مع ساز و سامان کے دیدیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ محمد! یہ جبراً لی جارہی ہیں یا خوشی سے؟ آپ نے فرمایا: یہ مانگی ہوئی چیز ہے جو واپس ہوگی اور اس میں کوئی نقصان ہوا تو اس کا بدلہ دیا جائے گا، مسند احمد کی

روایت ہے کہ ان میں سے بعض زرہیں ضائع ہوگئی تھیں یا ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قیمت ادا فرمائی لیکن صفوان نے ہرجانہ لینے سے انکار کر دیا کہ اب مجھے بس اسلام چاہیے۔

بے پناہ داد و دہش

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین اور طائف کی مہم سے واپس ہوئے اور جِعِرّانہ تشریف لائے تو آپ مال غنیمت پر نظر ڈال رہے تھے اور صفوان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، صفوان اس وادی کو بغور دیکھ رہے تھے جو اونٹوں بکریوں بھیڑوں اور چرواہوں سے تا حد نظر بھری ہوئی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر جانچ لی گہری نگاہ ڈال رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو وہب! یہ وادی (اور یہ دولت) تمہیں پسند آرہی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هو لك وما فيه (یہ وادی اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب تمہارا ہے) اس وقت صفوان نے کہا: ماطابت نفس أحد بمثل هذا إلا نفس نبيّ، (اتنی زبردست عطا کے لیے نبی کے علاوہ کسی اور کا دل گردہ نہیں ہوسکتا) اور اس کے بعد انہوں نے کہا اشهد ان لااله الا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله اور اسی وقت اسلام قبول کرلیا۔

(كنز العمال: طبع ۲، ۳۲۵/۱۰، البداية والنهاية ۳۰۸/٤، مسند احمد: ٤٦٥/٦، بحواله حياة الصحابة بتحقيق محمد عبدالله طارق طبع دهلي الجديدة ۱۹۸۷ء)

(۳) حویطبؓ بن عبدالعزیٰ، فرار اور واپسی

حویطبؓ کا خود اپنے متعلق بیان ہے کہ مکہ کے اہم اور نمایاں لوگوں میں سے جو لوگ فتح مکہ تک اپنے باپ دادوں کے مذہب پر قائم رہے ان میں سے کوئی بھی اسلام سے اور مکہ فتح ہوجانے سے اس قدر نفرت نہیں رکھتا تھا جتنی میں رکھتا تھا لیکن کیا کیا جائے تقدیر!

میں بدر کی جنگ میں مشرکین کے ساتھ شریک تھا اور میں نے بڑے عبرت ناک مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے، میں نے اپنی آنکھوں سے زمین وآسمان کے درمیان فرشتوں کو دیکھا جو (مشرکین کو) قتل کر رہے تھے اور گرفتار کر رہے تھے، اس وقت میں نے اپنے دل میں یقین کر لیا تھا کہ ھذا رجل ممنوع ''یہ شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً قدرتی مدد وحفاظت سے بہرہ یاب ہے'' لیکن میں نے اپنے مشاہدات کسی سے بیان نہیں کیے تھے، آخر ہم لوگ شکست کھا کر مکہ لوٹ آئے، ہم مکہ میں تھے اور دیکھ رہے تھے کہ قریش کے لوگ ایک ایک کر کے اسلام قبول کر رہے ہیں، پھر جب حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تو میں اس میں بھی (مشرکین کی طرف سے) پیش پیش تھا اور ہر آنے والا واقعہ اسلام کو ترقی ہی دے رہا تھا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہ رہا تھا اس کے خلاف کسی کی پیش نہیں چلتی تھی۔

ہم جب معاہدۂ صلح سے فارغ ہوئے تو میں اس کا آخری گواہ تھا اور میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو بھی حالات نمودار ہونگے وہ سب قریش کے لیے بُرے ہی ہونگے۔ چنانچہ جب آپ (آئندہ) عمرۂ قضا کے لیے تشریف لائے تو قریش کے سب لوگ مکہ سے باہر چلے گئے اور کچھ لوگ جو مکہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے ان میں سے میں اور سُہیل بن عمرو بھی تھے تا کہ مقررہ وقت پورا ہونے کے بعد (یعنی معاہدے کے مطابق عمرہ کر چکنے کے بعد) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باہر نکالدیں۔

جب تین دن پورے ہو گئے تو میں اور سُہیل بن عمرو گئے اور ہم نے کہا کہ ''آپ کی شرط پوری ہو چکی لہٰذا ہمارے شہر سے نکل جائیے'' فوراً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا: ''بلال! جو مسلمان ہمارے ہمراہ آئے ہیں ان میں سے کسی کو مکہ میں سورج غروب نہیں ہونا چاہئے''۔ (المستدرک للحاکم: ۳/۴۹۲)

جب مکہ فتح ہو گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے تو میں سخت خوفزدہ تھا اور میں نے اپنے اہل وعیال کو متفرق محفوظ جگہوں پر پہنچا دیا اور میں عوف کے گھر میں تھا کہ میری نظر دور سے ابوذر غفاریؓ پر پڑی، ان کے میرے درمیان گہری دوستی تھی اور دوستی ہمیشہ

حفاظت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ (لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ) میں نے جب ان کو دیکھا تو میں ان سے بھاگا، انہوں نے مجھے پکارا: ابومحمد! میں نے کہا لبیک! بولے: کیا ہوا (بھاگتے کیوں ہو)؟ میں نے کہا: خوف ہے! (واضح رہے کہ عربوں کا طریقہ تھا کہ جب کوئی کسی کو اس کی کنیت (یعنی فلاں کے ابو) کے لفظ سے پکارتا تو وہ گویا اس کو عزت واحترام دے رہا ہے، یہاں ان کو اسی طرح پکارا گیا تھا)۔

ابوذرؓ نے کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں، اللہ کی جان بخشی کے ساتھ تمہیں امن ہے، یہ سن کر میں ان کی طرف آیا اور میں نے سلام کیا، انہوں نے کہا اپنے گھر جایئے! میں نے کہا: کیا میں اپنے گھر جا سکتا ہوں؟ خدا کی قسم! میں نہیں سمجھتا کہ میں اپنے گھر زندہ سلامت پہنچ جاؤں گا، یا تو راستے ہی میں میرا قتل ہو جائے گا یا میرے گھر میں گھس کر میرا کام تمام کر دیا جائے گا! اور میرے اہل وعیال متفرق مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

حضرت ابوذرؓ نے کہا: اپنے اہل وعیال کو یکجا کر دو اور میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلتا ہوں۔

یہاں ضمناً یہ حقیقت بھی معلوم رہنی چاہیے کہ اسلام کا مشہور قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ مسلمان بھی کسی باغی کسی دشمن اسلام کو پناہ دیدے تو پھر سب کو یہ پناہ قبول ہوتی ہے، حتیٰ کہ کوئی عورت کسی کو پناہ دیدے یا کوئی غلام بھی پناہ دیدے تو وہ مقبول ہوتی ہے۔ (۱) عرب کا قدیم قومی طریقہ بھی یہی تھا کہ قبیلے کے کسی ایک شخص نے اگر کسی کو پناہ دیدی تو اس کو پورا قبیلہ قبول کرتا تھا اور پھر دوسرے قبائل بھی اس شخص سے کوئی مزاحمت نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی مزاحمت کرتا تو یہ گویا اس پورے قبیلے سے جنگ کرنے کے مرادف ہوتا تھا جس نے پناہ دے رکھی ہے اور یہی وہ راز تھا جس کو مغربی ممالک نہیں سمجھ سکے اور وہ اسامہ بن لادن کو پکڑنے کے لیے افغانستان پر دباؤ ڈالتے رہے، افغان قوم نے اپنی ہستی مٹادی اور آج کی تاریخ (۱۹ر تمبر ۲۰۰۸ء) تک اسامہ کو حوالے نہیں کیا، حالانکہ افغانیوں نے یہ بات بار بار بڑی صفائی سے کہی بھی تھی کہ اسامہ ہمارا

---

(۱) نصب الرایہ: ۳ر۳۹۶، الجامع الکبیر: ۲ر۲۸۲، وغیرہما

مہمان ہے ہم اس کو کسی بھی صورت میں حوالے نہیں کریں گے لیکن اتحادی فوجیں طاقت کے نشے میں چور تھیں وہ اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکیں اور افغانستان کو تو تباہ کر ہی دیا لیکن سچائی یہ ہے کہ انہوں نے خود کو بھی برباد کر لیا

پیوستہ است سلسلۂ موجہا بہم
خود را شکست ہر کہ دلِ ما شکستہ است(۱)

حُویطِبؓ کہتے ہیں کہ ابوذرؓ میرے ہمراہ چلے اور وہ راستے بھر یہ آواز لگاتے جا رہے تھے کہ جو یطب کو امن ہے کوئی ان کو چھو بھی نہ دینا، حویطبؓ کہتے ہیں اس کے بعد میں بے فکر ہو گیا اور اپنے اہل و عیال کو ان کے ٹھکانوں پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوذرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے بارے میں بات کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ (کچھ مخصوص اسباب کے تحت) جن چند (نام زد) لوگوں کو قتل کرنے کا میں نے حکم دیدیا ہے ان کے علاوہ تمام لوگوں کے لیے امنِ عام ہے؟

حویطبؓ کہتے ہیں اس کے بعد ابوذرؓ میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا: حویطب! آخر کب تک؟ اور کہاں تک؟ تم بہت سے مواقع سے پیچھے رہ گئے ہو! خیر و سعادت کے بہت سے مواقع تم نے کھو دئے اور بہت سے مواقع ابھی موجود ہیں (جن کو تم حاصل کر سکتے ہو!) تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ اور اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے بڑھ کر رشتوں کا لحاظ کرنے والے، تمام لوگوں سے بڑھ کر نیکی کرنے والے، تمام لوگوں سے بڑھ کر حلیم و بردبار ہیں، ان کی عزت خود تمہاری عزت اور ان کی بڑائی خود تمہاری اپنی بڑائی ہے۔

حویطبؓ نے کہا: اچھا میں آپ کے ساتھ چل کر وہاں حاضر ہوتا ہوں، چنانچہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے آپ اس وقت ایک کھلے میدان میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ

(۱) یعنی تمام موجوں کا سلسلہ ایک دوسری سے جڑا ہوا ہے، اس لئے جس نے ہمارا دل توڑا ہے اس نے دراصل خود اپنے آپ ہی کو توڑ ڈالا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا کہ جب ان کو سلام کرنا ہوتا ہے تو کیا کہا جاتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یوں کہو: السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہٗ، میں نے جب یہ کہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وعلیک السلام حویطب! پھر انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت سے نواز دیا۔

حویطبؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے اسلام لانے سے بہت خوش ہوئے، میں آپ کے ہمراہ حنین اور طائف کے معرکوں میں شریک رہا، اور مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مال غنیمت میں سے سو اونٹ عطا فرمائے۔

(حیاۃ الصحابۃ عربی: ۲۶۶/۱، بحوالہ حاکم: ۴۹۳/۳، تحقیق محمد عبداللہ طارق)

(۴) نُضَیرؓ بن الحارث عبدری قریشی

نضیرؓ بن حارث کا شمار قریش کے بڑے عقلمند اور دانا لوگوں میں ہوتا تھا، مشہور محدث اور تاریخ نگار حافظ ابن عبدالبر النمری القرطبی (وفات ۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد یہ بار بار اللہ کا شکر کیا کرتے تھے کہ اس نے مجھے اسلام کی توفیق دی اور میرے باپ دادوں اور میرے بھائی (نضر بن حارث جو جنگ بدر میں یا وہاں سے واپسی پر حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا) کی طرح میں اسلام سے محروم نہیں مر گیا۔ (الاستیعاب ۵۶۵/۳ علی ہامش الاصابہ)

اسی طرح وہ اس بات پر بھی بہت شکر کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی عطا فرمائی، یہ اپنے اسلام کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں قریش کے ساتھ ہر معرکے میں (اسلام کے خلاف) شریک ہوا اور میں برابر محسوس کرتا رہتا تھا کہ میں خود کو برباد کر رہا ہوں، جنگ حنین میں بھی ہم اس تمنا کیساتھ نکلے کہ شاید اسی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شکست ہو جائے چنانچہ ہم انکے خلاف لڑے (مگر یہ حسرت بھی سینے کی سینے ہی میں رہ گئی) اور

انہی حالات میں مکہ فتح ہوگیا۔

یہ کہتے ہیں کہ (جنگ حنین کے بعد) جب آپ مقامِ جعرانہ پر تھے اچانک میرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آمنا سامنا ہوگیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ بڑی مسرت کے ساتھ میری طرف متوجہ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نُضیر! میں نے کہا لبیک! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے بارے میں غور کرو، میں نے عرض کیا: میں غور کر رہا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ تو ان کو مزید استحکام عطا فرما۔

یہ قسم کھا کے کہتے ہیں کہ اس کے بعد میرا دل دینی پختگی اور حق وصداقت کی حمایت کے لیے پتھر کی طرح مضبوط ہوگیا۔ (الاصابة لابن حجر العسقلانیؒ : ۵۵۸/۳)

انسانی رحم دلی کا نقطۂ عروج

اسلام کی تاریخ میں ایسے بہت لوگ ہیں جو اسلام کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن اور پیغمبر اسلام کے خون کے پیاسے تھے لیکن جب مکہ فتح ہوا جو پورے خطۂ عرب پر اسلام کے مکمل غلبے اور شرک وبت پرستی کی جڑیں مکمل طور پر کٹ جانے کا کھلا اعلان تھا اور جس کے بعد اسلام کسی مصلحت اندیشی کے لیے قطعاً مجبور نہیں رہا تھا اور دنیا کے تمام فاتحوں کی نفسیات کے لحاظ سے وہ بہترین وقت تھا کہ اپنے عمر بھر کے دشمنوں کو چن چن کر ہلاک کیا جائے اور ان سے بھرپور بدلہ لیا جائے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میں کرم اور نوازش اور رافت ورحمت کا بے مثال مجسمہ ثابت ہوئے انتقام تو دور کی بات ہے از خود محبت آمیز لہجہ میں گفتگو کر کے ان کو اسلام کی دعوت دی اور سینے سے لگا لیا۔

اس کتاب کا مرتب محمد عبداللہ طارق کہتا ہے کہ اس روئے زمین پر اس آسمان کے نیچے یہ صرف اور صرف محمد عربی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی منفرد ذاتِ گرامی تھی جو ایسے ایسے سخت دشمن بھی ان رحمت بھری کملی میں ماں باپ سے زیادہ پیار کے حقدار ہوگئے تھے، ورنہ کوئی اور ہوتا تو ان

دشمنوں کے زندہ جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی آنکھوں میں لوہے
کی گرم سلاخیں اتار دیتا اور ان پر خوں خوار کتے چھڑوا دیتا جس کی مثالیں
آج کی مہذب کہلانے والی دنیا کے ''مہذب ترین'' فاتحوں نے عراق کے
نہتے اور معصوم قیدیوں کے ساتھ عراق کی ابوغریب جیل اور کیوبا کے
گوانتاناموبے میں کھل کر پیش کی ہیں۔ مگر رحمت عالم رحمتِ عالم ہی ہیں۔

یہ نمونہ ہے پوری دنیا کے اور ہر دور کے تمام مسلمانوں کے لیے، مسلم فاتحوں کے لیے، داعیان اسلام کے لیے، مسلم اہل قلم کے لیے، مسلم صحافیوں کے لیے اور مجاہدین کے لیے کہ ہمارے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، قرآن مجید کی ہدایت تمام مسلمانوں کے لیے یہی ہے کہ اگر تم اللہ کی خوشنودی کے طلب گار اور آخرت کی کامیابی کے امید وار ہو اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کو یاد رکھنے والے ہو تو زندگی کے ہر معاملے میں اور کامیابی یا ناکامی کے ہر مرحلے میں تمہارے لیے نمونۂ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی ہے۔ اس سے اگر ذرا بھی ہٹے تو تمہارے یہ تینوں نشانے خطا کر جائیں گے، نہ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکو گے، نہ آخرت کی کامیابی پا سکو گے اور نہ تمہاری اللہ کی یاد اور اس کی وفاداری معتبر ہو گی۔

یہ چار حضرات جن کے اسلام لانے کا حال ہم نے لکھا ہے یہ چاروں وہ ہیں جن کے باپ یا بھائی یا قریبی رشتے دار جنگ بدر یا کسی اور معرکے میں اہل اسلام کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے ان کی اسلام دشمنی میں علاوہ قدیم آبائی مذہب سے وابستگی کے یہ شخصی اور ذاتی رنجش بھی شامل تھی لیکن یہ لوگ اپنے اسلام پر انتہائی خوش تھے۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ نضیرؓ بن حارث اس بات پر بار بار اللہ کا شکر کیا کرتے تھے کہ اپنے باپ دادوں اور اپنے بھائی کی طرح میں بھی کفر و شرک پر نہیں مر گیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دیدی۔

مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن عاص فرمایا کرتے تھے کہ میں جب تک اسلام نہیں لایا تھا تو

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ دشمن تھا اگر اسی حال میں میری موت آجاتی تو میں لازمی طور پر جہنمی تھا، وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب میں نے اسلام قبول کرلیا تو مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد شرم آتی تھی چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سانس تک میں نے شرم کی وجہ سے کبھی آپ کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملائی۔

(الاستیعاب:۲/۵۱۴، والاصابۃ:۳/۳)

مستقبل کے لیے اور آنے والی قوموں کے لیے رحمت عالم کی ہدایات

قریش چونکہ آپ کا خاندان ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو تاکید فرمائی کہ استوصوا آل قریش بالناس، (قریش کے لوگو! تمام انسانوں کے لیے میں تمہیں ہمدردی کی وصیت کرتا ہوں)۔(اتحاف السادۃ شرح الاحیاء:۱۰/۲۹۰)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ قبطیوں (اہل مصر) کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اس لیے کہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنا ہماری ذمہ داری ہے ان سے ہمارے رحم (خاندانی رشتے داری) کے تعلقات ہیں (الطبرانی فی الکبیر ۱۹/۶۱) راوی کہتے ہیں کہ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ قوم قبط سے ہی تھیں (الطبرانی باسنادین ورجال احدھما رجال الصحیح۔مجمع الزوائد:۱۰/۶۳)

یہ بات جب صحابہ کرامؓ نے قبطیوں کو سنائی تو وہ حیران ہوکر بولے کہ قرابۃ بعیدۃ لایَصِل مثلھا إلا الانبیاء (بڑی دور کی قرابت ہے ایسی قرابت کا لحاظ رکھنے والے صرف انبیاء ہی ہوسکتے ہیں)۔(حیاۃ الصحابہ عربی:۱/۳۳۹، بتحقیق محمد عبداللہ طارق)

آئندہ جنگوں میں یا کسی بھی موقع پر جو قیدی مسلمانوں کے قبضے میں آنے والے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی (مجمع الزوائد:۶/۸۶، فیض القدیر:۱/۵۰۲) غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی تاکید فرمائی (مجمع الزوائد: ۴/۲۳۶) حکم دیا کہ جو تم کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ، جو تم پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکوں اور حبشہ والوں سے جنگ کرنے کو منع فرمایا اور حکم دیا کہ جب تک وہی پہل نہ کریں ان سے نہ الجھنا، حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں ان کے ایک گورنر نے ترکوں پر حملہ کر دیا تھا جب ان کو پتہ چلا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان کے حوالے سے انہوں نے ان کو سختی سے روکا (مجمع الزوائد: ۵/۳۰۳،۳۰۴) اس کے اسباب کیا ہیں یہ ایک الگ چیز ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ترک اسلام کے لیے بڑے زبردست خادم ثابت ہوئے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام ہر بہانے سے انسانیت کو قریب کرنے اور سینے سے لگانے کی تعلیم دیتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو اللہ رب العالمین کا بندہ اور نبی رحمۃ للعالمین کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔

آج کی برتر اور ترقی یافتہ قوموں کے لیے نبی رحمت کا پیغام

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیردوں کے ذریعے دنیا میں جو انقلاب آیا وہ چونکہ صرف روحانی اور مذہبی حد تک نہیں تھا بلکہ وہ انقلاب روحانی اور اخلاقی کے ساتھ ساتھ مادی بھی تھا اور وہ صرف کسی ایک خطۂ زمین تک محدود نہ تھا بلکہ عالمی پیمانے پر آیا تھا، اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتیں بھی ٹوٹ کر اسلام کے ماتحت آگئی تھیں، اس لیے اس عظیم انقلاب میں پوری دنیا کے لوگوں کے لیے اور عالمی سطح پر تمام قوموں کے لیے اور بالخصوص آج کی برتر اور ترقی یافتہ قوموں کے لیے زبردست پیغام ہے کہ وہ سمجھیں اور سیکھیں کہ جب کسی قوم کو دولت کی فراوانی اور قوت واقتدار کا ایک بڑا مقام حاصل ہو جائے تو اسے انسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔

دنیا کے تمام بڑے انسانوں کے بھرپور احترام اور ماضی کی تمام اہم شخصیات کی پوری پوری عزت کرنے کے باوجود ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سبق نبی رحمت کے سوا دنیا کے کسی انسان کی زندگی میں نہیں پایا جاتا، ہر انسان دولت واقتدار حاصل ہونے کے بعد بدل جاتا ہے۔

اقتدار اور مال واولاد کی فراوانی (عموماً) انسان کے بگاڑ کا سبب ہے

قرآن مجید نے افراد اور قوموں کی اس فطری کمزوری کو بہت واضح طور پر بار بار بیان فرمایا

ہے نہ مال و اسباب کی فراوانی اور اولاد و اقتدار کا حصول آدمی کو راہ راست سے بھٹکا دیتا ہے، سورہ کہف کی ۳۲ ویں آیت اور اس کے بعد مسلسل ایک شخص کا حال بیان کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ واضرب لھم مثلاً رجلین... یعنی:

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ (مکے کے ان متکبر و مغرور سرداروں کے سامنے) ایک مثال پیش کیجئے کہ دو شخص تھے، ان میں سے ایک کو تو ہم نے انگور کے دو باغ عطا کیے اور ان کے ارد گرد کھجور کے درختوں کی قطاریں لگا دیں اور ان درختوں کے درمیان ہم نے کاشت کی زمین رکھی تھی (پھلوں کے لیے باغ اور اسی میں غلے کے لیے کھیت بھی) یہ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور ان کے پھلدار ہونے میں کوئی کمی نہیں رہی، (مزید یہ کہ) ان باغوں کے درمیان ہم نے نہر جاری کر رکھی تھی، (ہماری ان نعمتوں سے) اس شخص کو خوب فائدہ ہوا۔

(اس صورت حال نے اس نادان شخص کے اندر اپنے رب کی شکر گزاری پیدا کرنے کے بجائے یہ اثر دکھایا کہ وہ غرور میں مبتلا ہو گیا) وہ اپنے پڑوسی سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ''میں تجھ سے زیادہ دولت مند اور تجھ سے زیادہ افرادی طاقت رکھتا ہوں'' پھر وہ (مغرور شخص) اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے یہ کہتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا کہ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی اور مجھے امید نہیں کہ کبھی قیامت بھی قائم ہوتی ہے اور اگر بالفرض (ایسا کچھ ہوا بھی اور) مجھے اپنے رب کی بارگاہ میں جانا پڑا تو لازماً میں وہاں اس سے بھی اعلیٰ درجے کی نعمتیں پاؤں گا (میں قسمت کا دھنی ہوں، جس قسمت نے یہاں سب باغ و بہار ہے وہی قسمت وہاں بھی میری یاوری کرے گی)۔

اس کے (غریب صاحب ایمان) پڑوسی نے اسے جواب دیا کہ تو اس ذات پاک (جل شانہ) کی ناشکری کرتا ہے جس نے تجھے اولاً مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے مکمل انسان بنادیا اور جہاں تک میری بات ہے تو (میں یقین رکھتا ہوں کہ) میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اسکے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور جب تو اپنے باغ میں گیا تھا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، کسی میں کوئی طاقت نہیں سوا اسکے جسے وہی طاقت دے)۔

اور مجھے جو تو مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بہت ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر (نعمتیں) عطا فرمادے اور (بہت ممکن ہے کہ) تیرے باغ پر وہ آسمان سے کوئی آفت بھیجدے اور وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے۔ یا تیرے باغ (کے کنوؤں اور اس کی نہروں) کا پانی زمین میں اتر جائے پھر تو اسے کسی طرح نہ حاصل کر سکے (آخر وہی ہوا) اس کا سارا پھل ضائع ہو گیا، اس نے دیکھا کہ اس کا لگایا ہوا انگوروں کا باغ اس کی ٹٹیوں پر الٹا پڑا ہوا ہے، اسے دیکھ کر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا، پھر اس نے کہا کہ کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہوتا۔ (لیکن اب پچھتانا فضول تھا) اب اسکے لیے نہ کوئی مددگار حمایتی تھے اور نہ وہ خود اپنی اس آفت کا مقابلہ کر سکا، اس وقت جاکر یہ حقیقت اس کے سامنے آئی کہ تمام تر اختیار صرف اسی خدائے برحق کا ہے، اجر وانعام وہی بہتر ہے جو وہ عطا کرے اور جو انجام وہ دکھائے وہی بہتر ہے۔ (سورۂ کہف: ۱۸، آیت: ۳۲ تا ۴۴)

مال و دولت کی فراوانی اور وسائل کی کثرت عموماً آدمی میں سرکشی پیدا کرتی ہے اور وہ سچائی کے قبول کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے، سورہ قلم میں اللہ تعالیٰ نے ایک دشمن حق وصداقت کی

نو برائیاں بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ یہ تمام برائیاں اس کے اندر اس لیے پیدا ہوگئیں کہ اَن کا ن ذا مال وبنین (وہ مالدار اور صاحب اولاد ہوگیا ہے) اور اسی مال واولاد کی مروڑ میں وہ قرآن مجید کے پیغام کو "پرانے افسانے" قرار دیتا ہے، (سورت: ۶۸/آیت ۱۰/تا ۱۵)

یہ مالی فراوانی چونکہ انسانی طبیعت کے بگاڑ کا بڑا سبب ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کبھی کبھی افراد اور قوموں کے مال واسباب پہ زوال لا کر ان کی سرکشی کو لگام دیا کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولقدارسلنا إلى امم من قبلک... "اے نبی اکرم! آپ سے پہلے بھی ہم نے بہت سی قوموں کی طرف اپنے پیغمبر بھیجے اور (ان کی سرکشی کو لگام دینے کے لیے) ہم نے ان کو تنگی ترشی میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں"۔

اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

"انہوں نے یہ کیوں نہیں کیا کہ جب ان کے اوپر ہماری طرف سے سختیاں آئی تھیں تو وہ (ہمارے سامنے) عاجزی کرتے؟ بلکہ (ان کا معاملہ تو اور الٹا ہوگیا) ان کے دل تو اور زیادہ سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو تسلی دیدی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو ٹھیک کر رہے ہو"۔ (سورہ: ۶/آیت: ۴۲،۴۳)

داعی کو حکم ہے کہ کسی کا حال کچھ بھی ہو آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ گمراہی میں پڑے لوگوں کو قرآن مجید کے ذریعہ ہدایت کی روشنی دکھاتے رہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وذکربہ ان تبسل... آپ ان کو قرآن مجید سنا کر نصیحت کرتے رہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے کرتوتوں کے وبال میں پھنس جائیں۔ (اگر ایسا ہوا تو) پھر اللہ کے سوا ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ سفارشی، (اس کے بعد) وہ ہر ممکن فدیہ دے کر بھی چھوٹنا چاہیں گے تو (اول تو ان کے پاس پیش کرنے کے لیے ہوگا ہی کیا؟ اور اگر بالفرض وہ دے دیں) تب بھی وہ قبول نہ ہوگا یہ وہی لوگ ہونگے جو اپنے کیے کی پاداش میں پکڑے جائیں گے، ان کو اپنے ان کفریہ اعمال کے نتیجے میں کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے ملے گا اور دردناک عذاب بھگتنا پڑے گا"۔ (قرآن مجید: ۶/۷۰)

مختلف قسم کے نشے

جو قبولِ حق سے مانع ہوتے ہیں

انسان کی زندگی میں مختلف قسم کے "نشے" پیش آتے رہتے ہیں جن سے سرشار ہو کر وہ انسانی خوبیوں سے محروم اور حق وانصاف کے تقاضوں کو سمجھنے سے بے بہرہ ہو جاتا ہے، یوں تو یہ انسانی اخلاقیات اور بشری نفسیات کا طویل موضوع ہے، تاہم قرآن مجید اور سنت نبوی کی روشنی میں ہم مختصراً اس کا کچھ بیان کرتے ہیں:

(۱) جسمانی طاقت کا نشہ

قوم عاد کے لوگ بہت لمبے چوڑے قوی ہیکل بڑے قد وقامت کے مالک تھے ان کو اپنی اسی طاقت پر ناز ہو گیا اور وہ کہنے لگے مَن اَشد منا قوۃ (ہم سے بڑھ کر کون طاقت ور ہے؟) (سورت:۴۱، آیت:۱۵) اور اس سرکشی اور غرور کی وجہ سے انہوں نے اپنے پیغمبر کا خدائی پیغام نظر انداز کر دیا، نتیجہ یہ کہ ہلاک کر دیئے گئے، قرآن مجید میں کئی مقامات پر انکا حال بیان کیا گیا ہے۔

(۲) کاروبار اور دولت کا نشہ

اہل مَدیَن جو بڑی تجارت پیشہ اور دولت مند قوم تھی اور ناپ تول کی بے ایمانی میں مبتلا تھی ان کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیبؑ کو بھیجا لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ ان کے متکبر و مغرور لوگوں نے یہاں تک دھمکی دی کہ شعیب ہم تمہیں بھی اپنی

آبادی سے نکال باہر کریں گے اور ان لوگوں کو بھی جو آپ کے ساتھ ایمان لائے ہیں (۷/۸۸)
آخر خدا کا عذاب آیا اور سخت دھماکے اور زلزلے سے وہ لوگ تباہ کر دیے گئے اور صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے ہوئے پائے گئے، وہ ایسے برباد و بے نشان ہوئے کہ کان لم یغنوا فیھا (جیسے یہاں کبھی بسے ہی نہیں تھے) (۷/۹۱-۹۲-۱۱/۹۴)

(۳) شاندار عمارتوں کا نشہ

قوم عاد کے بعد عرب کی قدیم قوموں میں سے ایک قوم ثمود ہے جو مقام حِجر میں پہاڑوں کی چٹانیں تراش تراش کر شاندار عمارتیں بناتے تھے اور ان کے مکانات چونکہ پہاڑوں کے درمیان تھے اس لیے وہ ان کو انتہائی محفوظ عمارت سمجھتے تھے، قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ آمنین (وہ بے خوف اور مطمئن تھے) (۱۵/۸۲)

یہ تو ان کے رہائشی مکانات تھے اور میدانی علاقے میں انہوں نے شاندار محلات تعمیر کیے تھے (۷/۷۴) انہی کی قوم کے پیغمبر حضرت صالحؑ نے ان کو سمجھایا، اللہ کی عبادت کرنے اور اس کی نعمتوں پر اس کا شکر کرنے کی ہدایت کی لیکن ان کے غرور و تکبر نے ان کو اندھا کر دیا تھا، انہوں نے سرکشی کی اور اللہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ یاصالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین (صالح! اگر تم واقعی اللہ کے پیغمبر ہو تو جاؤ وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو) چنانچہ "ایک زوردار دھماکے کے ساتھ سخت زلزلہ آیا اور وہ اپنے ان مکانات اور محلوں میں اوندھے پڑے رہ گئے" (۷/۷۸)۔

(۴) اقتدار کا نشہ

فرعون کو اس کے اقتدار کے نشے نے خدائی کا دعویٰ کرنے تک پہنچا دیا اور اس نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بے اقتدار ہونے کو ان کے ناحق ہونے کی دلیل سمجھ لیا، چنانچہ اپنے صاحب اقتدار ہونے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان وسائل سے خالی ہونے کو اس نے اپنے

سچا ہونے اور ان کے غلط ہونے کی دلیل سمجھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے پکار کر کہا:

الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار... کیا یہ واقعہ نہیں کہ میں مصر کی سلطنت کا مالک ہوں اور یہ نہریں میرے نیچے بہہ رہی ہیں، کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ (تم خود ہی سوچو) میں بہتر ہوں یا یہ شخص (موسیٰ) جو ذلیل اور بے حیثیت ہے جو اپنی بات بھی کھول کر بیان کرنے کے لائق نہیں (اگر یہ ایسا ہی خدا کا برگزیدہ ہے تو) اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اتار دئے گئے؟ یا اس کے ساتھ ساتھ فرشتے پرا باندھ کر کیوں نہیں چلتے؟ (اپنی اس دلیل کے ذریعے فرعون نے اپنی قوم کے لوگوں پر جو اثر ڈالا تو) اس نے پایا کہ وہ بڑے بے وزن اور کم فہم ثابت ہوئے اور وہ اس کے فرماں بردار ہو گئے اور وہ (پہلے سے) تھے ہی بے کردار و بد عمل''۔

(سورت:۴۳، آیت:۵۱تا۵۴)۔

فرعون کی اس تقریر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت مصری عوام کو اور خود فرعون کی قوم اور اس کے اعوان وانصار کو متاثر کرنے لگی تھی اس لیے اس نے اپنی مادی برتری اور حضرت موسیٰ کی اس میدان میں بے حقیقتی کو واضح کیا۔

قرآن مجید نے بتا دیا کہ فرعون کی تقریر کا جادو ان لوگوں پر اس لیے چل گیا کہ وہ خود ہی بے کردار اور بد عمل تھے یا تو فکر ورائے سے خالی اور بات کی معقولیت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلیل و برہان کو سمجھنے سے قاصر تھے یا ایسے بے ضمیر تھے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے حق سے آنکھیں چرا گئے اور جس طرح فرعون نے ان کو دولت واقتدار کی چمک دکھائی وہ اسی کے گرویدہ ہو گئے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یاد رکھیے آسمانی سچائی اور پیغمبرانہ دعوت کے مقابلے میں جب کوئی حکمراں، کوئی لیڈر، کوئی

قومی پیشوا یا مسخ شدہ مذہبی معتقدات کا نمائندہ عوام کو ورغلاتا ہے تو ہمیشہ لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں:

۱۔علم وفہم سے خالی، کم عقل اور کوتاہ فہم لوگ، یہ لوگ بے سوچے سمجھے ہوا کے رخ پر چل پڑتے ہیں، ان کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ:

''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی''

جب تک باطل زور پکڑے رہتا ہے یہ باطل کے ساتھ رہتے ہیں اور جب باطل تباہ ہوکر حق وصداقت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو یہ حق کے ساتھی بن جاتے ہیں۔حقیقت میں یہ نہ باطل کے ساتھی ہوتے ہیں نہ حق کے پیروکار، بلکہ یہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑنے والے بے حقیقت خشک پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔

۲۔دوسرا گروہ عقل وفہم اور بصیرت والوں کا ہے جو حالات کو سمجھتا ہے حق وناحق کو پہچانتا ہے، اچھے برے نتائج کو سمجھتا ہے لیکن جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ:

- حق وانصاف کیا ہے؟
- میرے ضمیر کا تقاضا مجھ سے کیا ہے؟
- قوم وملک کا حقیقی مفاد کونسی بات میں ہے؟
- اس دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد بھی حق کی اس صریح آواز کو نظر انداز کر دینے کے نتائج کیا ہونگے؟

لیکن اپنے وقتی ذاتی مفاد کے لیے باطل کا ساتھ دیتا رہتا ہے عملاً وہ بھی ہوا کے رخ پر ہی چلتا ہے، جب ہوا کا رخ بدل جاتا ہے اور حق وصداقت کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو یہ دونوں گروہ بھی یدخلون فی دین اللہ افواجاً کا منظر پیش کرتے ہیں یعنی جوق در جوق حق وصداقت کے دائرے میں آنے لگتے ہیں۔

ظاہر ہے انکا یہ آنا حق وصداقت کی معقولیت جان کر نہیں ہوتا بلکہ قوت واقتدار کے سامنے

جھکنا ہوتا ہے، تاہم اسلام اس آنے کو بھی قبول کرتا ہے لیکن ''بااقتدار اسلام'' میں آنے والے کبھی بھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے سچائی کے جذبے سے ''بے اقتدار اسلام'' کا ساتھ دیا تھا اور اس کے لیے قربانیاں دی تھیں۔

۳- تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو حق و صداقت کے پیغام کو دل سے قبول کرتا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر آنے والے تمام خطرات کو جھیلنے کے لیے اور تمام مفادات کو قربان کر کے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیشہ دنیا میں انقلابات ایسے ہی لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر آیا کرتے ہیں، مذہبی انقلاب ہو یا سیاسی کبھی مفاد پرستوں، بے ضمیروں خود غرضوں اور ابن الوقت قسم کے لوگوں کے بل پر برپا نہیں ہوا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

> ''تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد مال خرچ کریں گے اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے اپنا مال خرچ کیا ہے اور جہاد کیا ہے، ان کا درجہ بعد میں مال خرچ کرنے والوں اور بعد میں جہاد کرنے والوں سے (یقیناً) بڑھا ہوا ہے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی کے لیے اچھے وعدے فرمائے ہیں اور جو بھی کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے'' (۵۷/۱۰)۔

اپنے ضمیر سے غداری کرنے والے اپنی قوم اور ملک کے بھی غدار ہوتے ہیں

اکثر قوموں پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت آتا ہے جب اقتدار اعلیٰ اور حکومت وقت قومی و ملکی مفاد سے ہٹ کر شخصی اور ذاتی مفاد پر چلنے لگتی ہے اور قوم و ملک کے حقیقی مفاد سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پھر صدر مملکت یا زمام اقتدار پر قابض شخص حکام کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی مرضی پوری کرانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ کسی قوم و ملک کی تاریخ میں یہ ایک بہت ہی خاص موقع اور ٹرننگ پوائنٹ ہوتا ہے کہ اب اس قوم و ملک کی گاڑی درست پٹری پر چلتی رہتی ہے یا بربادی کے راستے پر پڑ جاتی ہے۔

جب سربراہ مملکت کے مشیر بھی اغراض کے غلام بن کر اورحق وصداقت اورضمیر کی آواز سے منہ موڑ کر اپنے شخصی اور ذاتی مفادات پر نظر رکھنے لگتے ہیں اور اپنے سربراہ کی چشم وابرو کو دیکھ کر رائے دینے لگتے ہیں تو یہ پورے ملک اور قوم کے ساتھ خیانت اور غداری ہوتی ہے اور اس کی سزا پوری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے اور ان ضمیر فروشوں کی یہ غلطی کبھی معاف نہیں ہوا کرتی ۔

اس کی تقدیر میں محرومی ومظلومی ہے
قوم جو کرنہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اور اس طرح کے "میر جعفر" اور "میر صادق" ہر قوم میں اور ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں جو ؎

"ننگِ ملت، ننگِ دین، ننگِ وطن"
ثابت ہوتے ہیں

عہد نبوی کے ایک عیسائی پادری کی بے ضمیری

قرآن مجید میں دو جگہ واضح طور پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ یہ اہل کتاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی برحق ہونا اس طرح غیر مشکوک طور پر جانتے ہیں جس طرح اک باپ اپنے بیٹے کو اچھی طرح پہچانتا ہے (سورت:۲، آیت ۱۴۶ اور سورت ۶، آیت ۲۰)

اور پہلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ان میں کچھ لوگ جانتے بوجھتے حق بات کو چھپاتے ہیں۔

چنانچہ کُرزؓ بن علقمہ جو پہلے عیسائی تھے بعد میں اسلام لے آئے تھے انکا واقعہ ہے کہ نجران کے ستر عیسائیوں کا قافلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا جن میں چوبیس سربرآوردہ اور نہایت اہم لوگ تھے، ان میں ابوحارثہ بن علقمہ اور ان کے بھائی کُرزؓ بن علقمہ البکری النجرانی (وفات تقریباً ۴۵ھ مطابق ۶۶۵ء) بھی ایک ہی سواری پر سوار جارہے تھے، کرز اس وقت تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لاعلمی اور بے خبری میں بہت نفرت کرتے تھے، راستے میں جب ایک جگہ سواری کو

ٹھوکر لگی تو کرزؓ نے کہا تعس الأ بعد (دوروالے کا یعنی محمد کا براہو) بڑے بھائی ابوحارثہ نے یہ لفظ سنا تو کہا: تیرا براہو! کرز نے کہا: ایسا کیوں؟ حارثہ نے جواب دیا کہ جس پیغمبر کا ہم لوگ انتظار کر رہے تھے خدا کی قسم! یہ وہی تو ہیں! تو کرز نے کہا کہ جب آپ یہ جانتے ہیں تو پھر انکا اتباع کیوں نہیں کر لیتے؟

ابوحارثہ نے (جو عیسائیت کے بڑے عالم و مدرس تھے اور ان کے علم اور اثر و رسوخ اور عیسائی مذہب کے لیے ان کی خدمات کی وجہ سے رومی سلطنت ان کو بہت کچھ عزاز بخشتی تھی اور ان کی نگرانی میں بہت سے گرجے (کنائس) بنوائے تھے) جواب دیا کہ رومی حکومت نے جو ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے اور ان تمام گرجوں کی نگرانی ہمارے سپرد کر رکھی ہے ان کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ ہم اس نبی کا ساتھ دیں، اگر میں انکا اتباع کر لیتا ہوں تو لانتزعونا کل ماتری (یہ جو کچھ ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت تم دیکھ رہے ہو یہ سب کچھ چھن جائے گا)۔ (الاصابة: ۲۹۲/۳، الاستیعاب: ۳۱۰/۳، البداية و النهاية: ۱۸۲/۳، ۵۶/۵، الاعلام: ۲۲۱/۵).

بس یہ جملہ کرز کے سینے میں ایک نورانی میخ بن کر پیوست ہو گیا اور آخر ان کے اسلام کا سبب بن گیا۔ انجام کار دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا اور نہ رومی سلطنت رہی نہ ان کی وہ داد دہش رہی جس کی خاطر ابوحارثہ کی طرح کے نہ معلوم کتنے لوگ حق سے آنکھیں چرا رہے تھے اور حق و صداقت کا پیغام اور آسمانی کتابوں کی ہدایت جو ان لوگوں کے پاس اللہ کی دی ہوئی قوم کی عظیم امانت تھی اس میں خیانت کر رہے تھے۔

عالمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ وما ارسلناک الا کافةً للناس بشیراً ونذیراً ''اے نبی! ہم نے آپ کو تمام کے تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''۔ (سورت: ۳۴، آیت: ۲۸)

سورہ اعراف آیت: ۱۵۸، میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قل یا ایھا الناس انی

رسول اللہ الیکم جمیعا ''اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں''۔

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیگر انبیاء کرام خاص طور پر اپنی اپنی قوموں کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن میں تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہی زمانے میں صلح حدیبیہ کے بعد سن ۶ ھ مطابق ۶۲۷ء میں جو مختلف بادشاہانِ عالم کے نام دعوتی خطوط بھیجے ہیں وہ خود اس بات کی واضح شہادت ہے کہ آپ پوری دنیائے انسانیت کے لیے اور ہر ملک و قوم اور ہر زمانے کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

خسرو پرویز کے نام جو والا نامہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے اس میں بھی آپ نے لکھا ہے کہ إنی رسول اللہ إلی الناس کافة (میں تمام کے تمام انسانوں کے لیے اللہ کا رسول ہوں)۔ (تاریخ الطبری: ۳؍۹۰)

یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں آپ کی امت بھی عالمی امت ہے اور اپنے نبی کی چھوڑی ہوئی امانت پوری طرح انہی کے کاندھوں پر ہے۔

قوم برائے اقوام

مسلم قوم کو کائنات کے خالق و مالک نے قرآن مجید میں ایک ایسی قوم قرار دیا ہے جو دوسرے لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، ایک شخص صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے، اپنی اولاد، اپنے خاندان کے بارے میں سوچتا ہے، ایک شخص اپنی تنظیم و جماعت، اپنے اپنے ادارے (انسٹی ٹیوشن) کے بارے میں سوچتا ہے، اگر کوئی سوچ کا دائرہ ذرا وسیع کرتا ہے تو اپنی برادری اور اپنی قوم و ملک کے بارے میں سوچ لیتا ہے، بس اس سے آگے نظر نہیں جاتی، لیکن مسلم امۃ اور مسلم قوم کی ذمہ داری اور اس کا منصبی فریضہ یہ ہے کہ وہ ساری انسانیت کے لیے سوچے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله (سورت:۳/آیت:۱۱۰)

"تم (دنیا میں) ایک بہترین قوم ہو جسے لوگوں کی خاطر منظر عام پر لایا گیا ہے (اس لیے کہ) تم اچھی باتوں کی تاکید کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور خود بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا. (۲/۱۴۳)

''اور (اے مسلم قوم!) ہم نے تم کو ایک امت وسط (ایک معتدل گروہ) بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے تمام انسانوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو''۔

یعنی یہ امت ٹھیک ٹھیک سیدھی اور ہدایت کی شاہ راہ پر گامزن ہے جس میں کجی اور انحراف کا کوئی شائبہ نہیں اور ''وسط'' معتدل اور درمیانی کا مطلب یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام کے بعد اب یہ امت ہی اللہ تعالیٰ کے اور دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان واسطہ اور ذریعہ ہے، قرآن مجید کی امین اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہونے کے حیثیت سے اب اسی قوم کا یہ منصب ہے کہ پوری انسانی برادری کو اللہ کا پیغام پہنچائے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیں تربیت یافتہ مسلمان اپنے آپ کو دنیا کے لوگوں کے سامنے یہی کہہ کر پیش کرتے تھے کہ ''ہمیں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے'' ان کے الفاظ تھے:

اللّٰہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة اللّٰه، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها، ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام.

''ہمیں اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے تاکہ جو شخص (بخوشی) بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آنا چاہے، جو دنیا کی تنگدامانیوں سے نکل کر اس کی وسعتوں میں آنا چاہے، جو مختلف مذاہب کی زیادتیوں اور ان کے ظلم وجور سے آزاد ہو کر اسلام کے عدل وانصاف میں آنا چاہے اسے ہم اس سے نکال لائیں''۔

اور اس کے بعد ان کے الفاظ تھے: فأرسلنا بدينه إلى خلقه لندعوهم إليه، یعنی ''اسی پروردگار عالم نے ہمیں اپنا دین اپنا پسندیدہ طریقۂ زندگی دے کر اپنی تمام مخلوق کے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم انہیں ان کے خالق و مالک کی طرف بلائیں''۔

یہ گفتگو حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فارس کی افواج کے سپہ سالار مشہور بہادر رستم کے سامنے اس وقت کی تھی جب خلافتِ فاروقی کے دور میں مسلم مجاہدین ایران پہنچے تھے۔

(حیاۃ الصحابہ عربی: ۱/۲۲۷-۴/۶/۶۳، بتحقیق محمد عبداللہ طارق، ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی ۱۳)

تقریباً یہی الفاظ دوسرے دن حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے تھے جب رستم نے ان سے بات چیت کی اور اسلام کے متعلق سوالات کیئے تو اسلام کی بنیادی باتیں بتانے کے بعد انہوں نے اسلام کا مقصد بتاتے ہوئے فرمایا: إخراجُ العباد من عبادة العباد إلى عبادة الله ''یعنی اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لے آنا''۔ رستم نے اسلام کے متعلق مزید سوالات کیئے تو حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور اس لحاظ سے وہ سب کے سب باپ شریک اور ماں شریک بھائی ہیں۔

(حوالۂ سابق: ۳۲۶/۱)

رستم کا ایک اہم خواب

اس واقعہ سے پہلے رستم نے ایک خواب دیکھا تھا -- اور یاد رہنا چاہئے کہ خواب بھی انسان کو قدرت کی طرف سے اہم وارننگس یا رہنمائیاں دیتے ہیں -- اس نے دیکھا تھا کہ ''آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا ہے اور اس نے اہل فارس کے تمام ہتھیاروں پر مہر لگائی اور وہ ہتھیار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہتھیار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیدیئے''۔ (حوالۂ سابق: ۳۲۵/۱، عن البدایۃ والنہایۃ: ۳۸/۷)

یہ تصور دینا دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان صرف اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو باپ شریک اور ماں شریک بھائی کہہ کر سب کو یکساں درجہ دیا ہے، یہ باتیں تاریخ کے جس دور میں ہورہی تھیں، وہ مسلمانوں کی پیہم فتوحات کا دور تھا اور ان کی حیثیت عالمی سطح پر ایک فاتح قوم کی تھی لیکن ان کی اس برتر پوزیشن نے ان کے ذہنوں سے اسلام کی اس بنیادی تعلیم کو فراموش نہیں ہونے دیا کہ کوئی قوم فاتح ہو یا مفتوح، طاقت ور ہو یا کمزور، متمدن اور ترقی یافتہ ہو یا پچھڑی ہوئی بہر حال اولاد آدم ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے سب ہمارے بھائی ہیں اور ایک مسلمان کی بحیثیت مسلمان یہ مذہبی، قومی اور ملّی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کا پیغام ہر شخص کو پہنچائے اور اسے اپنے برابر کا درجہ دے۔

قرآن اور اسلام کی رو سے اسلام وہ مذہب ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کا واحد مذہب تھا وہی اسلام اب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث امت کے ذریعہ پوری انسانیت کو دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اہل اسلام کو تمام انسانوں پر گواہ بنایا گیا ہے یعنی یہ دنیا کے انسانوں کو اسلام کی دعوت دیں گے جو تمام انسانیت کا مذہب ہے پھر کس نے ان کی دعوت قبول کی اور (پوری طرح پیغام حق واضح ہو جانے کے باوجود) کس نے اس پیغام کو رد کر دیا، اس بات کی گواہی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں یہی امت مسلمہ دے گی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی گواہی دیں گے کہ میری امت میں سے کس کس نے واقعی انسانیت کو اس کی امانت پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا اور کون اس امانت کے پہنچانے میں کوتاہ رہا تھا۔

گویا اس آیت میں جہاں سارے انسانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی عدالت میں جواب دہی کے لیے تیار رہیں، وہیں خود مسلمانوں کو بھی وارننگ اور انتباہ دیا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے فریضۂ منصبی سے بے پرواہی برتی تو تمہارے خلاف اللہ کا رسول گواہی دے گا۔

اس عنوان کی پہلی آیت میں جو کہا گیا ہے کہ تم انسانوں کے بہترین گروہ ہو جو انسانوں کے لیے سامنے لایا گیا ہے اسی کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ یہ بہتری اسی صورت میں ہے کہ تم انسانیت کی رہنمائی کا اپنا فریضۂ منصبی بھی انجام دو، یعنی بہتری کا تمغہ اور افضلیت کا تاج صرف ''مسلمان'' نام رکھ لینے سے یا مسلم گھرانے میں جنم لے لینے سے حاصل نہیں ہو جائے گا بلکہ یہ اعزاز کسی کارنامے کے ساتھ مشروط ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے یہ آیت پڑھی تو اس کے بعد فرمایا: ''لوگو! جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس بہترین گروہ کا حصہ بنے اسی چاہئے کہ اس ''بہتری'' کے لیے اللہ کی مقرر کردہ شرط کو بھی پورا کرے'' حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ وہ شرط یہ ہے کہ:

- آدمی خود ایمان لائے (اور ایمان کے تقاضے پورا کرے)
- اچھی باتوں کا حکم کرے (ان کو رواج دینے کی ہر تدبیر کرے)

• بری باتوں کو روکے (اور برائی کو مٹانے کی تدبیریں کرے) (الدر المنثور للسیوطی: ۲/۶۳،۶۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ والذي نفسي بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكن الله أن يبعث عليكم عذاباً من عنده ثم لتدعُنه فلا يستجاب لكم.

"اس ذات گرامی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم لوگ اچھی باتوں کی تاکید کرتے رہو اور بری باتوں سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اپنا عذاب مسلط کر دے گا (اس عذاب کے جہاں اور بہت سے اثرات ہونگے ایک خاص نحوست و بدبختی اس کی یہ ہوگی کہ تم اپنی دعاؤں کی تاثیر کھو بیٹھو گے) پھر تم دعائیں کروگے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں ہونگی"۔

(ترمذی عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ۔ مشکوٰۃ رقم: ۱۵۴۰)

ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دولت کدے پر تشریف لائے چہرۂ انور سے بڑی فکر مندی اور تشویش نمایاں تھی، وضو کیا اور خاموشی سے مسجد میں تشریف لے گئے اور ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا: "لوگو! اللہ کا حکم ہے کہ تم اچھی باتوں کا حکم دو اور بری باتوں سے روکو اس سے پہلے کہ وہ وقت آجائے کہ پھر تم مجھ سے دعاء مانگو اور میں (تمہاری اس غفلت کی سزا کے طور پر) تمہاری دعائیں قبول نہ کروں، تم مجھ سے سوال کرو اور میں تمہاری مانگیں پوری نہ کروں اور تم (اپنے دشمنوں کے خلاف) مجھ سے مدد مانگو اور میں تمہاری کوئی مدد نہ کروں" بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں بیان فرمائیں اور ممبر سے اتر آئے۔

(ابن ماجہ، صحیح ابن حبان عن عائشہ رضی اللہ عنہا)

کسی بات کے کہنے کے انداز بہت سے ہوتے ہیں جہاں جس انداز سے کہنے کا موقع ہو وہ اختیار کیا جائے اور زبان سے کہنا ہی ضروری نہیں پیغام دینے کے سیکڑوں طریقے ہیں اصل مقصد حق کا پیغام انسانوں تک پہنچانا ہے اور سائنس وٹکنالوجی کی حالیہ ترقی نے تو ذرائع ابلاغ کی بے شمار شکلیں پیدا کر دی ہیں، ان سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام لیا جانا چاہیے۔

دعوت وتبلیغ کا مفہوم

''دعوت'' کا اصل مفہوم پکارنا بلانا، دعاء کرنا یعنی اللہ سے اپنی مدد کے لیے التجا کرنا ہے اس کے علاوہ اس لفظ کا استعمال دوسرے قریبی معنیٰ میں بھی ہے۔ اسی طرح تبلیغ کا اصل مفہوم پہنچانا ہے لیکن تبلیغ دین اور پیام رسانی کے مفہوم میں جب لفظ دعوت وتبلیغ بولا جاتا ہے تو کسی جزوی دینی پیغام رسانی کے لیے نہیں بلکہ پورے اسلام کی دعوت مراد ہوتی ہے جس کے مخاطب غیر مسلم ہی ہوتے ہیں۔

سورۂ احقاف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنا تو انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کے پاس آ کر کہا:

''اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کو بھی سچا بتاتی ہے اور حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف دعوت دینے والے کی بات قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آ ؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو بخش دیگا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچا دے گا''۔ (سورہ:۴۶، آیت:۳۰-۳۱)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو مکمل اسلام اور خدا تعالیٰ کے حضور اپنی

کامل سپردگی کی دعوت دی اس کو قرآن مجید میں ''دعوت'' کے لفظ سے ہی بیان کیا گیا ہے۔
(دیکھیے سورت:۷۱، آیت:۵تا۸)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۴، امة يدعون إلى الخير کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس دعوت الی الخیر کے دو درجے ہیں پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہے۔ مسلمانوں کا ہر فرد اور جماعت خصوصاً دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے زبان سے بھی اور عمل سے بھی''۔

معروف عالم دین و مفکر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے:

''انبیاء کرام علیہم السلام کے طرز دعوت و تبلیغ میں اصل مخاطب غیر مسلموں کو ہی بنایا جاتا ہے اور ان کے سخت دلوں کو ایمان و یقین، سوز دروں، اخلاص اور اسوۂ حسنہ کی روشنی اور گرمی سے موم بنا کر ایمان و عمل کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور جب اس طرح مومنوں کی امت تیار ہو جاتی ہے تو اسے نبوی تعلیمات سے آراستہ کر کے غیر مسلموں کو اللہ کے دین کی طرف مدعو کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور یہ کارِ نبوت پوری امت کے اہل افراد پر فرض قرار دیا جاتا ہے اور امت مسلمہ کو اسی دعوت کے لیے خیر امت قرار دیا گیا ہے''۔(ماخوذ از پیش لفظ کتاب دعوت اسلام ایک اہم فریضہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اسی طرح مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے بھی اپنی مشہور کتاب اسلام کیا ہے؟ میں لکھا ہے کہ:

جس طرح ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے راستے پر چلیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ''یہ بھی فرض کیا ہے کہ اس مقصد کے لیے ہم اس کے

دوسرے بندوں میں بھی کوشش کریں، اسی کا نام ''دین کی خدمت'' اور ''دین کی دعوت'' ہے''۔ اسی طرح قرآن مجید میں جہاں کہیں لفظ تبلیغ آیا ہے اس سے مراد پورے دین کی دعوت پیش کرنا اور اللہ کی ساری مخلوق کو اللہ کی فرماں برداری کی عمومی دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کر کے ان کی غفلت کو دور کرنا یقیناً بڑا کار ثواب ہے **لیکن اس کو مکمل دعوت نہیں کہا جا سکتا بلکہ** اس کا نام وعظ، پند و نصیحت، تلقین و ارشاد، تذکیر و تعلیم اور افہام و تفہیم ہے جس کی اپنی انتہائی افادیت ہے لیکن یہ دعوت و تبلیغ نہیں ہے''۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' نامی کتاب میں اس غلط فہمی کو تفصیل سے دور کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''تبلیغ اسلام کے معنیٰ پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا، یا اربابِ تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے''۔

آگے قاری طیب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اس انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت و افادیت سے اگرچہ انکار نہیں لیکن اسے فریضۂ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن مجید کے اصول تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ جزوی تبلیغ ''تذکیر و اصلاح'' کے عنوانات سے یاد کی جا سکتی ہے مگر عرفِ شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جا سکتا --- تبلیغ اپنے حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے''۔

اسی کتاب میں قاری صاحب موصوف آگے لکھتے ہیں:

''اس لیے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر سب نہیں تو کم از کم ارباب علم وبصیرت کی ایک جماعت سارے موہوم منصوبوں کو چھوڑ کر دعوت الی اللہ کے لیے کمر بستہ ہو جائے اور اپنوں سے گزر کر دوسری اقوام کے ساتھ انتہائی خیر خواہی، اعلیٰ ترین شفقت وملاطفت اور کامل ترین دلداری اور دل پذیری سے انہیں حق کی طرف مائل کرنے پر لگ جائے اور اس کی زندگی کا واحد نصب العین غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنا اور انہیں دعوتِ حق دینا ٹھہر جائے''۔

یہ پیغام نہ پہنچانے کا انجام

قرآن مجید میں جہاں خاص اہل ایمان (اسلام قبول کر لینے والوں) کو یا ایھا الذین آمنوا (اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو!) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے وہیں بے شمار آیات میں دوسری طرح یاایھاالناس (اے لوگو! یا اے انسانو!) اسی طرح یا بنی آدم (اے اولاد آدم!) کہہ کر بھی خطاب کیا گیا ہے جو ساری دنیا کے تمام انسانوں اور ہر زمانے میں آنے والے تمام لوگوں کے لیے ہے۔

اور قرآن چونکہ اہل اسلام کے پاس ہے اس لیے یہ انہی کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ اس پیغام کو دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچائیں۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سوا لاکھ مسلمانوں کے مجمع کو الوداعی خطاب کرتے ہوئے جو اسلام کی بنیادی باتیں تعلیم فرمائی تھیں ان کے بعد حکم دیا تھا کہ ألا (خبردار!) فلیبلغ الشاھد منکم الغائب (تم میں جو یہاں موجود ہے وہ غائبین کو یہ پیغام دیدے) گویا اس وقت کے تمام حاضرین کی ڈیوٹی تھی کہ اس پیغام اسلام کو یہ دوسروں تک پہنچائیں اور انہوں نے وہ ذمہ داری پوری کر دی اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بھی دوسروں تک پہنچائیں۔

آج یہ فریضہ عموماً چھوٹا ہوا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف طریقوں سے خبردار کر چکے ہیں کہ اگر تم نے یہ فریضہ چھوڑ دیا اور خدائے رحمان ورحیم کا یہ پیغام رحمت اس کے بندوں تک نہ پہنچایا تو ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کی پکڑ صرف غلط کاروں تک ہی آئے گی بلکہ جس طرح رحمت کے ٹھنڈے جھونکے عام ہوتے ہیں اور جس طرح آندھی طوفان اور زلزلے عام ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کی پکڑ بھی جب آئے گی تو عام ہی ہوگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''میری امت جب دنیا (اور اس کی دولت اور چمک دمک) کو کوئی بڑی چیز سمجھنے لگے گی تو اس کی ہیبت و وقعت (جو دنیا کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے) نکل جائے گی اور جب وہ اچھی باتوں کی دعوت دینا اور بری باتوں کی روک تھام کرنا چھوڑ دے گی تو وہ وحی کی برکتوں سے محروم ہو جائے گی اور جب یہ آپس میں گالی گلوچ کرنے لگے گی (ایک دوسرے کو برا کہنے لگے گی) تو اللہ کی نظروں سے گر جائے گی''۔

(الحکیم الترمذی عن ابی ہریرۃؓ، الجامع الصغیر: ۱/۴۰۴)

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی پکڑ کا قدرتی قانون بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''اگر کسی قوم وگروہ میں کوئی شخص خدا کا حکم توڑتا ہے اور وہ لوگ اس شخص کو روکنے کی طاقت رکھتے ہیں اور طاقت کے باوجود اسے باز نہیں رکھتے تو ان پر مرنے سے پہلے (اسی دنیا میں) کوئی نہ کوئی قدرتی سزا آکے رہتی ہے''۔ (ابوداود، ابن ماجہ ابن حبان عن جریرؓ بن عبداللہ)

ایک حدیث میں اس پوری دنیا کو ایک بڑے بحری جہاز سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی ایک سے زیادہ منزلیں ہوں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر نچلی منزل کے لوگ اپنی نادانی سے اس کے تلے میں سوراخ کرنا چاہیں تو کیا اوپر والے یہ کہہ کر بے فکر ہو جائیں گے کہ ہماری بلا سے پانی بھرے گا تو وہ ڈوبیں گے، ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ سب مل کر ایسے لوگوں کو یہ حماقت کرنے سے ہر قیمت پر روکیں گے اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ جب جہاز ڈوبے گا تو سبھی ہلاک ہونگے۔ (بخاری، ترمذی عن النعمانؓ بن بشیر)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھی باتوں کی دعوت دیا کرو، بری باتوں کی روک تھام کیا کرو ورنہ تمہارے اوپر بدترین حکمراں مسلط کر دیئے جائیں گے (پھر ان کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے) تمہارے (برے تو برے) تمہارے بہترین نیک لوگ بھی اللہ سے دعاء کرینگے تو ان کی دعائیں قبول نہیں ہونگی۔ (الطبرانی فی الاوسط، البزار، مجمع الزوائد: ۲۶۶/۷)

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملت اسلامیہ کیسی کیسی سنگین دلدلوں میں پھنسی ہوئی ہے اور جتنی اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی دعائیں ہوسکتی ہیں وہ بھی ہو رہی ہیں لیکن وہ سب کی سب بے اثر ہیں، اس بے تاثیری کا راز یہی ہے کہ ہم پوری انسانیت کی بڑی قیمتی امانت کو اپنے پاس دبائے بیٹھے ہیں اور تڑپتی بلکتی انسانیت کو ان کے زہر کا تریاق فراہم نہیں کر رہے ہیں۔

کسی شخص یا قوم یا گروہ کی ہیبت تمہیں دعوت حق سے نہ روک دے

بسا اوقات آدمی کسی غلط کام کرنے والے کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرتا ہے اور ٹوکنے کی ہمت نہیں کر پاتا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے **لا يمنعن احداً منكم هيبةُ الناس أن يقول بحقٍ إذا علِمَه** تم میں سے کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق بات کہنے سے نہ روکے جبکہ وہ حق بات کو جانتا ہے۔ (رواہ الترمذی واحمد باسانید صحیحہ۔ المشکوٰۃ رقم: ۵۱۴۵)

آدمی جب اپنے مخاطب سے کوئی لالچ نہ رکھے نہ اس کی کسی برتر حالت سے مرعوب ہو تو اس کو حق بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی اور ایک داعی کی یہی شان ہونی چاہیے کہ وہ ہر قسم کے بڑے چھوٹے لالچ سے بلند اور ہر طاقت سے بے خوف ہو۔

کون مانے گا کون نہیں؟ اس سے آزاد ہو جایئے

آدمی کبھی کبھی اپنا قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہی اندازے قائم کرنے لگتا ہے کہ میری کوشش نتیجہ خیز ہوگی یا نہیں؟ یہ سوچنا بنیادی طور پر مایوسی اور کم ہمتی کی نشانی ہے، کسان کھیت میں دانہ ڈالتے وقت یہ ہرگز نہیں سوچتا کہ کونسا دانہ اگے گا کونسا نہیں؟ وہ ہر دانہ اس امید کے ساتھ پھینکتا

ہے کہ وہ کبھی آگیں گے، سپاہی ہر گولی اس کوشش اور امید کے ساتھ چلاتا ہے کہ وہ نشانے پر ضرور پہنچے گی، اسی طرح داعی کو اپنی ہر کوشش اسی یقین واعتماد کے ساتھ کرنی چاہیے کہ وہ لازماً نتیجہ خیز ہوگی ان شاء اللہ۔

یہ سبق ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے ملتا ہے اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے وہ پہلے سے جانتا تھا کہ فرعون پر موسیٰ کی دعوت کا کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے لیکن حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ میں اس کو دعوت دینے کا حکم دیا وہ حوصلہ افزا اور امید بندھانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا لعله يتذكر أو يخشىٰ (امید ہے وہ نصیحت حاصل کرلے گا اور ڈر جائے گا)۔ (سورت: ۲۰، آیت ۴۴)

ظاہر ہے یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود پُر امید تھا اور نعوذ باللہ اس کی توقعات پر پانی پھر گیا! بلکہ یہ دعوت دینے کا ادب ہے، داعی اپنا ہر قدم امید وحوصلے کے ساتھ اٹھاتا ہے اور نتیجہ اللہ کے اوپر چھوڑ دیتا ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ تمہارا کام تو بات کو پوری طرح کھول کھول کر پہنچا دینا ہے اور یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ ہدایت اے نبی! آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے آپ تو اپنا کام کرتے رہیے ہدایت کس کو دینی ہے کس کو نہیں یہ ہمارے اوپر چھوڑ دیجیے۔

کتنے انبیاء کرام علیہم السلام ایسے ہیں کہ ان کی ساری دعوتی زندگی میں دو چار آدمیوں سے زیادہ ماننے والے نہیں ہوئے، حضرت نوح علیہ السلام نے نوسو سال سے زیادہ مدت اپنی قوم کو دعوت دی مگر کم وبیش چالیس آدمیوں سے زیادہ ماننے والے نہیں ہوئے، تو کیا نعوذ باللہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کی محنت کو ضائع سمجھا جائے گا! ہرگز نہیں۔

آپ کتاب کے آخری عنوان میں ایک واقعہ پڑھیں گے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے شروع دور میں حج کے موقع پر منٰی کے بھرے مجمع میں جب دعوت پیش کی تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ اس مجمع میں کوئی مرد کوئی عورت اور کوئی بچہ ایسا نہ تھا جس نے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر مٹی اور پتھر نہ مارے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر تھوکا نہ ہو، اور اس مجمع میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی بات نہیں مانی۔

لیکن یہ ہماری سخت نادانی ہوگی کہ اس پکار کو ہم بے کار سمجھیں، یہ بیج تھے جو سید الانبیاء کی زبانی انسانیت کی کھیتی میں ڈالے جارہے تھے اور آپ کی پکار جگہ جگہ پہنچ رہی تھی جس پر طرح طرح سے سوچا جارہا تھا چنانچہ بعد میں اس کے عمدہ نتائج دنیا نے کھلی آنکھوں دیکھے۔

مخاطب کی کسی بدسلوکی سے بددل نہ ہوں

قرآن مجید میں ایک اہم اصول مسلمان کی زندگی کے لیے یہ تعلیم فرمایا گیا ہے کہ یا ایها الذین آمنوا کونوا قوامین للّٰه شهداء بالقسط و لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقویٰ واتقوا اللّٰه إن اللّٰه خبیر بماتعملون.

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! اللہ کی خاطر سیدھی روش پر قائم رہنے والے اور حق بات کی گواہی دینے والے بنو اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل (اور غضبناک) نہ کردے کہ عدل وانصاف کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے، انصاف کرو یہی تقویٰ اور خوف خدا کے زیادہ قریب طریقہ ہے اور اللہ سے (ہمیشہ) ڈرتے رہو، بلاشبہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے''۔ (سورت:۵، آیت:۸)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو حکم دیا ہے ان اللّٰه یامر کم ...''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو پہنچایا کرو اور جب تم کچھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں یہ بہت ہی عمدہ نصیحت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً سب کچھ جانتا اور دیکھتا ہے''۔ (۵۸/۴)

یعنی کوئی شخص ہمارا دوست ہو، دشمن ہو ہمیں پسند ہو یا ناپسند ہو اسکا حق ہمیں لازماً دینا چاہئے، ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے فرمایا کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا! اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! کیا اس بات کی وجہ سے آپ میرا حق دبالیں گے؟ حضرت

عمرؓ نے جواب دیا کہ نہیں حق تو تمہارا تمہیں ضرور ملے گا--- بس یہی ذہن اک مسلمان کا ہر معاملے میں ہونا چاہئے اور یہی معاملہ "امانتِ پیامِ رحمت" کے بارے میں بھی ہونا چاہئے کہ ہر شخص کا یہ حصہ اسے پہنچایا جائے چاہے وہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند۔

حضرت وحشیؓ بن حرب جنہوں نے جنگ احد میں چھپ کر دھوکے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کر کے قتل کر دیا تھا جس کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد غم تھا کیونکہ وہ آپ کے چچا بھی تھے دودھ شریک بھائی بھی تھے اور اسلام کے زبردست حامی بھی، پھر یہ کہ اپنا سارا خاندان جہاں مخالف تھا یہ ایک بہادر سپاہی بن کر ساتھ دیتے تھے، بدر کی جنگ میں انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ جب وحشیؓ نے اسلام قبول کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکا ایمان منظور فرمایا حالانکہ اسلام کا دروازہ اگر کسی کے لیے بند رکھا جا سکتا تھا تو وہ وحشیؓ کے لیے بند ہوتا، مگر ایسا نہیں ہوا، بس طبعی اور فطری تقاضے کی بنا پر اتنا ہوا کہ جب وحشیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضری سے نہیں روکا صرف یہ فرمایا کہ غيب وجهك عني يا وحشي لا أراك (وحشی تم اپنا چہرہ مجھ سے اوجھل رکھا کرو میں تمہیں دیکھ نہ سکوں)۔

(الاستيعاب على هامش الإصابة: ٦٤٤/٣، والإصابة: ٦٣١/٣)

آپ اوپر بڑے بڑے سخت درجے کے دشمنان اسلام کے قبول اسلام کے واقعات پڑھ چکے ہیں کہ کس دل داری اور خوش اخلاقی سے انکا استقبال کیا گیا اور ان کے ساتھ کس قدر محبت وشفقت کا سلوک کیا گیا۔

آج بھی ممکن ہے کہ ہمارے شخصی یا قومی دشمن کو اسلام پیش کرنے کا موقع ہمیں میسر آئے یا یہ اسکا کچھ جھکاؤ اسلام کی طرف محسوس ہو تو محض دشمنی کی وجہ سے یہ سمجھنا کہ یہ دھوکہ ہے اس کو دعوت دینے اور اسلام کی تعلیمات اس تک پہنچانے میں سستی ہرگز نہ کی جائے، اگر بالفرض کوئی کسی

سیاسی غرض سے محض دھوکا دینے کیلئے بھی اسلام سے ہمدردی جتاتا ہے تب بھی آپ اس کو اسلام سے قریب لانے کی کوشش کیجئے کیا خبر ہے اسلام کی فطری کشش اس کو حقیقۃً اسلام کی طرف کھینچ لے۔

دوسرے یہ کہ ہمیں اس بات کا حق ہی کیا ہے کہ ہم کسی کے باطن کے بارے میں کوئی رائے زنی کریں! ایک جنگ کے موقع پر ایک بظاہر غیر مسلم نے مسلمان سپاہی کے سامنے ''السلام علیکم'' کہا جو گویا اس کی طرف سے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار تھا لیکن اس مسلمان سپاہی نے اس کو پھر بھی قتل کر دیا۔

یہ بات جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئی تو آپ نے باز پرس فرمائی کہ جب اس نے مسلمان ہونے کی علامت ظاہر کر دی تھی پھر بھی تم نے اسے کیوں قتل کر دیا؟ انہوں نے عرض کیا اللہ کے رسول! وہ تو اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا؛ آپ نے فرمایا هلا شققت قلبه فنظرتَ إليه؟ (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے؟)

اس پر سورہ نسا: نمبر۴، کی آیت نمبر:۹۴، نازل ہوئی: یا ایها الذین آمنوا... ولاتقولوا لمن ألقى إليكم السلام لست مومناً یعنی ''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! جب تم راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست اور دشمن میں امتیاز پیدا کر لیا کرو (اس طرح بے سوچے سمجھے اقدام نہ کیا کرو) اور جو شخص تمہارے سامنے سلام کر کے پیش قدمی کرے تم یہ نہ کہا کرو کہ تو مؤمن نہیں ہے''۔ (الدر المنثور للسیوطی: ۲/۲۰۰)

دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جو اس شخص کا سامان بطور مال غنیمت لے آئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ واپس کرایا، اس کا خون بہا دیا اور آئندہ بغیر تحقیق کے ایسا کوئی قدم اٹھانے سے مسلمانوں کو سختی سے منع کر دیا گیا۔ (حوالۂ سابق)

ایک اور شخص تھے مُحَلِّمْ بن جُثامة ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قافلے کا امیر بنا کر مقام اِضم کی طرف بھیجا یہ قافلہ جب وہاں پہنچا تو وہاں ایک شخص عامر بن الاضبط اشجعی ان لوگوں کے قریب سے گزرے اور ان لوگوں کو سلام کیا (جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ

مسلمان تھے) لیکن محلم اور عامر کے درمیان پرانی کبھی کی رنجش تھی اس لیے محلم نے عامر کے اوپر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔

یہ قافلہ جب واپس آیا تو قافلے والوں نے ساری روداد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی (محلمؓ کو محسوس ہو گیا کہ یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی ہے اور یقیناً آپ اس کو سخت ناپسند کریں گے چنانچہ) محلم بن جثامہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی درخواست کی آپ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: **لاغفر اللہ لک** (اللہ تمہاری بخشش نہ کرے) یہ روتے ہوئے اور اپنی چادر سے آنسو پوچھتے ہوئے وہاں سے نکلے اور اسی رنج وغم میں رہے اور ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ انکا انتقال ہو گیا، ان کو جب دفن کیا گیا تو کچھ ہی دیر گزری تھی لوگوں نے دیکھا کہ زمین نے ان کی لاش اوپر نکال پھینکی ہے، پھر دفن کیا گیا پھر یہی ہوا، کئی کئی بار یہی صورت پیش آئی آخر لوگوں نے اس کی اطلاع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إن الأرض لتقبل من هو شر من صاحبكم ولكن الله أراد أن يَعِظكم من حرمتكم** ''زمین تو بلاشبہ تمہارے اس آدمی سے بھی زیادہ برے لوگوں کو قبول کر لیتی ہے (اگل کر باہر نہیں پھینکدیتی) لیکن اللہ تعالیٰ (اس منظر کے ذریعہ) تمہیں نصیحت کرنا اور تمہاری نازک اور اہم ذمہ داری کے بارے میں سمجھانا چاہتا ہے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر لوگوں نے ان کی لاش کو دو پہاڑوں کے درمیان لیجا کر ڈالدیا۔ اس قسم کے یہ کئی واقعات ہو چکے تھے جن کے بعد سورہ نساء کی وہ اوپر والی آیت نازل ہوئی۔

(مجمع الزوائد: ۷/۸، سنن بیہقی: ۹/۱۱۵، طبقات ابن سعد: ۴/۲۸۲، البدایۃ والنہایۃ: ۴/۲۲۴، ۲۲۵، کما فی حیاۃ الصحابۃ عربی: ۲/۶۷۹ إلی ۶۸۱، تحقیق محمد عبداللہ طارق قلت وذکرہ السیوطی فی الدر المنثور: ۲/۲۰۰، وابن حجر فی الاصابۃ: ۳/۳۶۹، ۲/۴۵۷، ۲/۲۴۷)

اس واقعہ میں جو کئی کئی محدثین نے متعدد صحابہ کرامؓ اور کئی سندوں سے نقل کیا ہے متعدد اہم

سبق موجود ہیں مثلاً:

۱-اس سے ایک انسان اور مسلمان کی عظمت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی جان اتنی سستی اور معمولی چیز نہیں ہے کہ بلا تحقیق و تفتیش اس کے متعلق کوئی بھی قدم اٹھا دیا جائے۔

۲-اپنی قومی و ملی طاقت اور سرکاری وسائل کے ذریعہ ذاتی رنجشیں نکالنا کس قدر سنگین بات ہے، حضرت مُحَلِّمْ بن جثامة اور اس مقتول کے درمیان پرانی رنجش تھی، اب جبکہ یہ دونوں ہی دامن اسلام میں اور سایہ رحمت للعالمین میں آ چکے ہیں تو ان رنجشوں کو بالکل بھول جانا چاہئے تھا چہ جائیکہ اس کو یاد بھی رکھا اور پھر اسلام کی دی ہوئی طاقت یعنی اپنی فوجی اور سرکاری طاقت سے ذاتی دشمنی نکالی گئی۔

ہم رات دن اپنی عام زندگی میں دیکھتے ہیں کہ پولس والے کہیں جھگڑے میں پبلک کے ہجوم میں پھنس جائیں اور ان پر پتھراؤ ہو جائے، ان کی وردی پھاڑ دی جائے وہ زخمی ہو جائیں حالانکہ ان کے ساتھ ہر قسم کا ہتھیار موجود ہے مگر مجال ہے کہ ایک فرض شناس سپاہی اوپر سے آرڈر ملے بغیر فائر کھولدے!

ٹھیک اسی طرح اسلام کے سپاہی کے ساتھ خواہ کوئی کچھ بھی سلوک کرے لیکن وہ مشتعل ہو کر کوئی قدم اپنے ذاتی جذبات کے زیر اثر ہرگز نہیں اٹھا سکتا وہ جانتا ہے کہ میں رقیب عتید[۱] (ایک حاضر باش نگراں) کے سامنے اور باعیننا و وحینا[۲] (کسی کے زیر نگاہ اور زیر ہدایت) ہوں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے بتا چکے ہیں کہ إن معكم من لا يفارقكم (تمہارے ساتھ ہمیشہ ایک ہستی ہے اور کچھ ہستیاں رہتی ہیں جو کبھی تم سے الگ نہیں ہوتیں[۳])۔

۳-ایک داعی کا اپنے مدعو کے ساتھ انتقام کا نہیں گہری ہمدردی کا رشتہ ہونا چاہئے اور جو طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں کے بارے میں اختیار

---

(۱) سورت:۵۰،آیت:۱۸

(۲) سورت:۲۳،آیت:۲۷

(۳) رواه الترمذی عن ابن عمرؓ (المشکوٰۃ رقم ۳۱۱۵، والجامع الصغیر:۲/۱۲۶)

فرمایا وہی اپنانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو اور خصوصیت سے اسلام کے داعیوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ ولا تستوی الحسنة ولا السیئة .... إلا ذو حظ عظیم "نیکی اور بدی کبھی برابر نہیں ہوسکتیں، تم جواب میں وہ انداز پیش کرو جو بہترین ہو (اسکا نتیجہ) تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی تھی (نہ صرف یہ کہ دشمنی ختم ہوگئی ہے بلکہ) وہ تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے مگر (یہ عالی ظرفی کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے) یہ صفت انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صبر والے ہوں اور یہ مقام انہی لوگوں کو ملتا ہے جو بڑے نصیبہ ور ہوں"۔

اور ظاہر ہے کہ ایسی عالی حوصلگی کی جب کوئی ہمت کرے گا جس سے اسلام اور غیر اسلام کی دوریاں مٹتی ہوں تو شیطانی طاقتیں چین سے بیٹھی نہیں رہ سکتیں اس لیے آگے اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا علاج بھی تعلیم فرمادیا کہ اگر تمہیں شیطان (اس کے خلاف) اکسائے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لو یقیناً وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔ (۴۱/۳۴تا۳۶)۔

انسان اشرف المخلوقات

قرآن مجید کی سورت نمبر ۹۵، میں اللہ تعالیٰ نے چار قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں نہایت اعلیٰ صلاحیتیں دیکر پیدا کیا ہے، جسم کی جو موزونیت اور علم وعقل کی جو صلاحیتیں اور صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے جو امکانات انسان میں رکھے گئے ہیں روئے زمین کی کسی اور زندہ مخلوق میں نہیں رکھے گئے ہیں۔

اتنی خوبیوں کی مخلوق اس بات کی سزاوار نہیں ہے کہ اس کو ضائع ہو جانے دیا جائے اللہ تعالیٰ نے دسویں سورت (آیت: ۴۷) میں فرمایا ہے کہ "ہر امت کا ایک رسول ہوتا ہے" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لیے رسول ہیں، قرآن مجید میں سورہ سبا میں (سورت: ۳۴، آیت: ۲۸) میں فرمایا ہے کہ "ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو تمام کے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے نہیں"۔

اس طرح تمام کی تمام انسانیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور آپ کی دعوت کی مخاطب ہے، اب جس نے اس دعوت کو مان لیا وہ "امت اجابت" (قبول کر لینے والی امت) بن گئی اور جس نے ابھی نہیں مانا ہے اور اس کو ابھی دعوت دی جاتی ہے وہ "امت دعوت" ہے گویا ہر فرد بشر کا اللہ تعالیٰ سے بھی ایک خاص رشتہ قائم ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی، اللہ تعالیٰ سے تو اسکا رشتہ یہ ہے کہ یہ اس کی مخلوق بلکہ سب سے بہترین تخلیق اور اس کا سب سے اعلیٰ پروڈکشن (Best Production) ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا رشتہ امتی

ہونے کا ہے، ایک صاحب ایمان کو ان دونوں حیثیتوں کا بھی ہر لحہ لحاظ رہنا چاہئے کوئی شخص اچھا ہے یا برا، فرماں بردار ہے یا نافرمان، شکر گزار ہے یا ناشکرا بہرحال وہ ان دو صفتوں سے خالی اور اس دوہرے استحقاق سے محروم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی بہترین تخلیق اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہے۔

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ''پیامِ رحمت کی حامل امت'' یعنی ''امتِ اجابت'' اس بات کی واحد ذمہ دار ہے کہ وہ ان تقاضوں کو سمجھے اور اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو انجام دے۔

حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حشر کے میدان میں کسی بندے کے قدم اپنی جگہ سے اس وقت تک ہل بھی نہ سکیں گے جب تک کہ وہ اپنے متعلق ان سوالوں کا جواب نہیں دیدے گا، لاتزول قدما عبد حتی یسأل عن:

۱- عن عمره فيم أفناه ؟ (زندگی کہاں کھپائی؟)

۲- وعن علمه فيم فعل فيه؟ (اپنے علم کے متعلق کیا عمل کیا؟)

۳- وعن ماله من أين اكتسبه؟ وفيم أنفقه ؟ (مال کہاں سے کمایا؟ اور کہاں لگایا؟)

۴- وعن جسمه فيم أبلاه؟ (اپنے جسم اور تندرستی کو کہاں گھلایا؟) (الترغیب: ۱/۱۲۵)

ان تمام عطاؤں میں جن کے متعلق سوال ہوگا جسمانی اور علمی صلاحیتیں سب سے اہم ہیں جن کے متعلق سوال ہوگا اور جو اہم ترین مقصد ہے امت مسلمہ کو اس دنیا میں بھیجے جانے کا اور جس کی یاد دہانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے الوداعی خطبے اور ''وسیع ملی وصیت نامے'' میں بھی فرمائی ہے۔

کافر کون ہے؟

داعی (جو شخص کسی کو اپنے کسی پیغام، اپنی فکر، اپنے کسی نظریے کی طرف دعوت دیتا اور بلاتا ہے) اور مدعو (جس کو وہ دعوت پیش کی جارہی ہے) کے درمیان اعتماد کا پایا جانا ضروری ہے کم از کم داعی فرد یا داعی قوم اپنے مدعو کو برے الفاظ سے یاد نہ کرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا پُر حکمت ارشاد ہے:

ثلاث يُصفين لك ودَّ أخيك: تسلم عليه إذا لقيته، وتوسع له في المجلس، وتدعوه بِأحبّ اسمائه إليه. (الطبراني في الاوسط، والحاكم في المستدرك، والبيهقي في شعب الايمان عن عثمان بن طلحة الحجبي، كما في الجامع الصغير: ٣/٤ (٣)).

''تین باتیں ایسی ہیں جو تمہارے بھائی کے دل میں تمہارے لیے صاف ستھری خالص محبت کو جنم دیتی ہیں:

۱- جب تمہاری اس سے ملاقات ہو تو (اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے) تم اسے سلام دعاء کرو۔

۲- اور (جب وہ آئے اور تم مجلس میں پہلے سے بیٹھے ہوئے ہو تو ذرا سرک کے) اسے مجلس میں جگہ دو۔

۳- اور (جب تم اسے مخاطب کرو تو) اسے جس نام ولقب سے پکارا جانا پسند ہو اسی لفظ سے اسے مخاطب کرو۔

یہ ایک ایسا کامیاب نسخہ ہے کہ آپ کا مخاطب خواہ کوئی بڑا ہے یا چھوٹا، کوئی اسلامی بھائی ہے یا وطنی بھائی یا انسانی برادری کا فرد، ہر ایک اس نسخۂ تسخیر کا لازماً اسیر ہو جائے گا اور اس کا دل آپ کی طرف ضرور مائل ہو جائے گا۔

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

لفظ کافر کی لغوی تحقیق

اب ذرا لفظ ''کافر'' کی حقیقت پر غور کیجئے اس لیے کہ یہ لفظ بھی ایک بڑا پردہ ہے داعی اور مدعو کی درمیانی راہ میں بلکہ غیر مسلم بھائیوں کی نگاہ میں یہ ایک گالی ہے جو مسلمانوں کی طرف سے انہیں دی جاتی ہے۔ اس لیے اس لفظ کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اس لیے سب سے پہلے ہم عربی لغت کی مدد سے اس کی تحلیل وتجزیہ کرتے ہیں:

کافر کا مادہ (اس کے بنیادی حروف) ک ف ر ہیں، یہ دو بابوں کے آتا ہے یعنی اس کا استعمال دو شکلوں میں ہوتا ہے۔

(۱) ایک کَفَرَ یَکْفُرُ (یعنی باب نصر سے) جس کے معنی ہیں رد کر دینا، کسی بات کو قبول نہ کرنا۔

(۲) دوسرا کَفَرَ یَکْفِرُ (یعنی باب ضرب سے) جس کے معنی ہیں چھپانا، کسی حقیقت پر پردہ ڈال دینا، یعنی ماضی (PAST) دونوں کا یکساں ہے صرف مضارع (فیوچر Future) میں فرق ہے، پہلے میں ف پر پیش ہے، دوسرے میں زیر اس لفظ کا زیادہ استعمال پہلے ہی باب یعنی پہلی ہی شکل میں ہوتا ہے دراصل اسی مادے سے وہ لفظ ''کافر'' بنا ہے جس پر ان سطروں میں ہم گفتگو کر رہے ہیں:

کفر کی سات قسمیں

اور اس ''الکفر'' کو ہم سات قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) اول یہ کہ انسان خدا کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

(۲) یا اس کے وجود کو تو تسلیم کرے لیکن اس کی حاکمیت اور اپنا اور تمام کائنات کا مالک ومختار اور اپنا اور سارے انسانوں کا معبود ماننے اور اس کے حکموں کی تعمیل کرنے سے انکار کر دے، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ یہ مخلوق بے شک پیدا تو خدا ہی نے کی ہے لیکن پیدا کرنے کے بعد اب وہ معطل اور غیر ضروری ہو گیا، اب یہ کائنات خود بخود اپنے فطری اصولوں پر چل رہی ہے، قرآن مجید نے اللہ کی دو صفتوں حی اور قیوم کے ذریعہ اسی نظریے کی تردید کی ہے، یعنی وہ خالق کائنات بھی ہے اور فعال ومدبر ومنتظم کائنات بھی ہے۔

(۳) تیسری قسم یہ کہ اس کو معبود بھی مانتا ہے اور ساری مخلوق پر اس کے لیے حکمرانی کا حق بھی تسلیم کرتا ہے لیکن انسانوں کے لیے خدا کی پسند نا پسند جاننے کا جو واحد ذریعہ ہیں یعنی پیغمبران عظام علیہم السلام ان کو تسلیم نہیں کرتا اور ان پر ایمان نہیں لاتا ہے، درحقیقت یہ بھی نتیجے کے لحاظ سے نہ

ماننے ہی کے مرادف ہے اس لیے کہ کوئی شخص کتنا ہی عقل وخرد کا مالک ہو لیکن صرف عقل کی بنیاد پر اللہ کی مرضی یا نامرضی کو نہیں جانا جا سکتا، اس کے لیے وحی کا سہارا لینا انسان کی مجبوری ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

(۴) اور یہ بھی انکار وجحود اور نافرمانی ہی کی ایک قسم ہے کہ آدمی اللہ کے احکام کو اور نبیوں کی تعلیمات کو اپنی عقل کے پیمانے سے ناپے یا اپنے ذوق اور اپنی پسند ناپسند کی کسوٹی پر پرکھے اور جو اس کی نگاہ میں قابل قبول ہو اسے مانے باقی کو رد کر دے، قرآن مجید میں اس کو افتؤ منون بعض الکتاب وتکفرون ببعض کہہ کر غلط قرار دیا ہے یعنی کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے پر ایمان لاؤ گے اور ایک حصے کو رد کر دو گے؟۔(سورت:۲، آیت:۸۵)

یعنی ایسا ماننا بھی اللہ کی نظر میں ماننا نہیں رد کر دینا ہی ہے اور اس کو بھی قرآن مجید کفر ہی قرار دیتا ہے۔

(۵) اور اسی میں شامل ہے پیغمبروں میں تفریق کر کے کسی کو قبول کرنا اور کسی کو رد کر دینا بھی، اس لیے کہ قرآن مجید کی نگاہ میں تمام پیغمبران عظام ایک ہی پیغام کے حامل تھے، ایک کو رد کرنا بھی کو رد کر دینا ہے۔

(۶) پیغمبروں کی وہ بنیادی اور لازمی ہدایات، وہ عقائد واخلاق اور قوانینِ زندگی جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کہہ کر پیش کیا ہے ان کو قبول نہ کرنا بھی کفر ہی ہے۔قرآن مجید کا حکم ہے ما أتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا (رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے قبول کرو اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دیں اس سے باز آ جاؤ۔سورت ۵۹، آیت:۷)

(۷) کفر کی ایک قسم کفرِ جحود وعناد بھی ہے کہ آدمی دل سے جان رہا ہے کہ جو بات ہمارے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ سراسر حق ہے لیکن زبان سے اقرار نہ کرے یا موقع دیکھ کر زبان بھی اس کی سچائی کا اظہار کر دے لیکن ضد میں یا حسد میں یا کسی مفاد کی خاطر اس کی پیروی کرنے اور حق

کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہ ہو[1] جیسے ابلیس کا کفر یا جیسے ذیل کے یہ چند لوگ جن کے اوپر یہ آیت پوری طرح صادق آتی ہے: وجحدوا بها واستيقنتها أنفسهم... ”انہوں نے سراسر غرور و تکبر کی وجہ سے ہماری نشانیوں کا انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل ان کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے“۔ (سورت:۲۷، آیت:۱۴):

مان کر بھی نہ ماننے والے

• مشہور عرب شاعر امیہ بن ابی الصلت ثقفی جس نے قدیم آسمانی کتابوں کا مطالعہ کر کے اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت سمجھ لی تھی اور لوگوں سے اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ میں نے محمد کی پیروی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن جب لوگوں نے اسے بتایا کہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں اس کے ماموں زاد بھائی عتبہ اور شیبہ اور بڑے بڑے سردار مارے جا چکے ہیں تو اس نے ان لوگوں کا مرثیہ کہا اور تعصب اور سخت طیش میں آ کر اسلام کا دشمن ہو گیا۔ (الاصابہ:۱/۱۲۹)

• یا جیسے اسی کتاب میں ابو حارثہ بن علقمہ کا ذکر آچکا ہے کہ[2] اس نے دل سے بھی جان لیا تھا اور اپنے بھائی کرز بن علقمہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کھل کر اعتراف بھی کیا تھا کہ محمد بن عبداللہ ہی وہ رسول ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے لیکن جب کرزؓ نے کہا کہ پھر آپ ان کی پیروی کیوں نہیں کر لیتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ رومی حکومت ہمیں جو امداد دیتی ہے اور جس کے بل پر ہم یہ عیش کر رہے ہیں یہ سب یک لخت ختم ہو جائے گا۔

• یا جیسے بہت سے لوگ یہود میں بھی ایسے تھے کہ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ یہی وہ آخری رسول ہیں جن کا ذکر توریت میں آیا ہے لیکن چونکہ یہ ان کی نسل بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں اس لیے وہ ان کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

بعض مفسرین کی رائے ہے کہ سورہ اعراف کی ذیل کی آیت کچھ اسی قماش کے لوگوں کے

(۱) کفر کی یہ تمام قسمیں اور ان کی تفصیلات کتب لغت تاج العروس وغیرہ اور مفسرین کے اقوال اور قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں لکھی گئی ہیں۔ (۲) دیکھیے صفحہ ۶۱۔

بارے میں نازل ہوئی تھی: واتل علیهم نبا الذي اٰتینا اٰیاتنا فانسلخ منها...." آپ اے نبی مکرم! ان لوگوں کے سامنے اس شخص کا حال بیان کیجئے جس کو ہم نے اپنی آیتوں کا علم عطا کیا تھا پھر وہ ان آیات (کے تقاضوں) سے نکل بھاگا آخر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ بھٹکنے والے گروہ کا حصہ بن گیا" (۱۷۵/۷) اور آیت کا مقصود چونکہ اس مزاج پر نکیر کرنا تھا اس لیے نہ کسی شخصیت کا نام لیا گیا نہ اس کی طرف کوئی واضح اشارہ کیا گیا۔

کفر کی یہ آخری قسم کفر بمعنی ستر و کتمان (چھپانے) کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اور نسلی تعصب و مفاد پرستی پر بھی، قرآن مجید میں ہے کہ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت کو وہ اس طرح غیر مشکوک طریقے پر جانتا پہچانتا ہے جیسا کہ باپ اپنی اولاد کو پہچانتا ہے لیکن جانتے بوجھتے یہ لوگ سچائی کو چھپاتے ہیں۔ (سورت:۲، آیت:۱۴۶)

ہر زمانے میں کفر کی یہ تمام قسمیں پائی گئی ہیں۔

کوئی شخص لفظ کافر کا مستحق کب ہوگا؟

کفر کی چوتھی اور ساتویں قسم جس میں ایک شخص کسی انسان کی تعلیم و تبلیغ اور دعوت کے بغیر خود اپنے پہلے سے موجود ذرائع سے اسلام کی حقانیت پہچان چکا ہے اور پھر ہٹ دھرمی سے انکار پر اڑا ہوا ہے اسنے تو خدا، حق و انصاف، دین و دیانت بلکہ خود اپنے ضمیر سے بھی بغاوت کر رکھی ہے۔ اس کے کفر کا معاملہ مذکورہ تمام قسم کے کفروں سے جداگانہ ہے۔ باقی جتنی قسم کا کفر ہے اس میں انکار کرنے اور رد کر دینے کا مفہوم خود لفظ میں پایا جاتا ہے اور "رد کر دینے کے" لفظ میں خود بخود یہ مفہوم شامل ہے کہ اسے "کوئی چیز پیش کی گئی" جسے اس نے رد کر دیا اور "پیش کر دینا" اس کا نام نہیں ہے کہ اتفاق سے کوئی بات کسی کے سامنے آ گئی یا کان میں پڑ گئی یا یہ کہ قرآن مجید ہر جگہ لائبریریوں میں اور بک اسٹالوں پر موجود ہے لوگ اسے جب چاہیں پڑھ سکتے ہیں یہ پیش کر دینا نہیں اور نہ اس طرح کے عدم قبول کو "رد کر دینا" کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے لیے لمحہ فکریہ

یہاں ہم مسلمانوں کو خود اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم نے انسانی برادری کے سامنے (اپنے اپنے وطن میں اور بیرون وطن بھی) اسلام اور قرآن کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ انہیں اپنی بات پوری طرح سمجھانے کا حق ادا کر دیا ہو؟ جس کے بعد ایک انصاف پسند آدمی کو رد کر دینے کی گنجائش باقی نہ رہے؟

سمجھانے کا مکمل مفہوم یہ ہے کہ زبان سے تحریر سے، اپنی عملی زندگی کے نمونے سے کسی نظام کو پوری طرح سمجھایا جائے، پھر اپنے اس نظام کے مطابق ایک معاشرہ قائم کر کے اس کا قابل عمل ہونا واضح کر دیا جائے اور پھر ممکن ہو تو اس معاشرے میں آسمانی ہدایت کے مطابق اس مطلوبہ نظام کو قائم کر کے اور پھر اس کے موعودہ بہترین نتائج کا مشاہدہ کرا کے بھی دکھایا جائے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام شکلوں میں اپنے نظام کو واضح کر کے دکھایا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس.. یتفکرون ''اور ہم نے اے نبی! یہ مجموعۂ یادداشت (قرآن مجید) آپ کے اوپر نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے آپ ان باتوں کو خوب کھول کھول کر بیان کر دیں جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں اور تاکہ وہ لوگ غور و فکر بھی کر لیں''۔ (سورت:۱۶، آیت:۱۹)

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین (اگر لوگ آپ کی دعوت سے منھ پھیر لیتے ہیں تو آپ کی ذمہ داری تو بس کھول کر پوری طرح پہنچا دینا ہے)۔ (سورت:۱۶، آیت:۸۲)

برادران اسلام! کیا ہم واقعی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی انسانی برادری کے سامنے یا ماضی میں بھی صدیوں سے ہم اس فریضے کو اس مکمل شکل میں پیش کر چکے ہیں؟ جس کے بعد آدمی سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب ہم ''ہاں'' میں نہیں دے سکتے! اور جب پیش نہیں کیا گیا تو رد کر دینے کا کیا سوال! اور جب صورت حال یہ ہے تو لفظ کافر کے حقدار

دنیا میں بہت ہی تھوڑے لوگ نکلیں گے۔ایک دوسری طرح اس بات کو یوں سمجھئے کہ اسلام قبول نہ کرنے والے لوگ کل دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کو پوری طرح کسی نے اسلام پیش ہی نہیں کیا اور نہ وہ خود اپنے ذرائع سے اسلام کو سمجھ سکے، دوسری قسم وہ ہے جنہوں نے اسلام کو پوری طرح (جیسے ساتویں قسم) یا بڑی حد تک (جیسے چوتھی قسم) سمجھ لیا لیکن کتمان حق سے کام لیا اور قبول نہیں کیا۔

ان میں سے پہلی قسم پر تو ''کافر'' کا لفظ صادق ہی نہیں آتا اس لیے کہ ان کو اسلام پیش ہی نہیں کیا گیا تو رد کر دینے کا کیا سوال ہے لہٰذا ان کو ''کافر'' کہنا بے انصافی ہے، ان کی حالت ''دور فترت'' (کسی بھی نبی کی تعلیمات سے خالی دور) کی سی ہے، جیسے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی دور میں عرب کے امی اور بے علم لوگ تھے۔اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مخاطب کرکے فرمایا ہے **یا اھل الکتاب قد جاء کم رسولنا یبین لکم علی فترۃ من الرسل..** ''اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا (یہ) رسول پیغمبروں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آیا ہے اور دین کی باتیں واضح طور پر بتا رہا ہے (یہ ہم نے اس لیے کیا ہے) تاکہ تم یہ عذر نہ کرسکو کہ ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آیا ہی نہیں تھا۔ (سورت:۵،آیت:۱۹)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے پاس کوئی سمجھانے بتانے والا نہیں آیا اور وہ آسمانی ہدایت سے خالی دور میں ہی پیدا ہوئے اور مر گئے وہ ایک بڑی حد تک معذور مانے جائیں گے۔اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بعض اکابر علماء حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ یہاں کے غیر مسلموں کو اسی بنیاد پر کافر نہیں کہتے تھے۔اس آخری دور کے مشہور عالم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے جب ان کے ایک شاگرد نے) سن ۱۹۷۹ء میں) مدینہ منورہ میں سوال کیا کہ:

''وہ عوام الناس جنہوں نے اسلام کا نام بھی نہیں سنا اور جنہیں اسلام کی کوئی تبلیغ نہیں کی گئی کیا انہیں عذاب ہوگا؟''۔

تو شیخ الحدیث صاحب اس سوال پر زار و قطار رونے لگے اور انہوں نے اس کا کوئی جواب

نہیں دیا بلکہ غیر مسلموں میں دعوت اسلام کے کام پر توجہ دینے کی تاکید فرمائی اور بس اتنا فرمایا:

''اس پر ضرور کام ہونا چاہئے اور اس موضوع پر اسلام کے محاسن پر کتابیں ہونی چاہئیں''

(اقرأ ڈائجسٹ، کراچی، نومبر ۱۹۷۶ء بحوالہ سہ ماہی السلام نئی دہلی، اپریل تا جون ۲۰۰۱ء)

اور جہاں تک اسلام قبول نہ کرنے والوں کی دوسری قسم کا تعلق ہے جن کے اپنے ذرائع نے اسلام کی صداقت ثابت کردی وہ بلاشبہ خود اپنے ضمیر کی عدالت سے کفر کا فیصلہ پا چکے ہیں ہمارے لیے شریفانہ اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے لیے بھی ہم کافر کا لفظ نہ بولیں جیسا کہ اس عنوان کے شروع میں ہم نے حدیث کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور جیسا کہ آپ حضرت عکرمہؓ بن ابوجہل کے تذکرے میں اسی کتاب میں پڑھ چکے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کو ہدایت فرمائی تھی کہ عکرمہ اسلام قبول کرنے کے ارادے سے آرہے ہیں تم ان کے والد ابوجہل کو برا نہ کہنا ایسی باتیں ان دنیا سے چلے جانے والوں کو تو لگ نہیں جاتیں لیکن ان کے زندہ رشتے داروں کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔

اس سے ایک مستقل اصول یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس لفظ سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہو وہ چاہے سچ ہی کیوں نہ ہو اس سے پرہیز کیا جائے اس لیے کہ دل آزاری کرنا بہر حال حرام ہے۔

خلاصہ یہ کہ لفظ کافر ایک حقیقت کا اظہار ہے اور وہ حقیقت موجود بھی ہے لیکن کسی شخص کے متعلق متعین طور پر کافر کا لفظ بولنا واقعے کے لحاظ سے خلافِ احتیاط اور مشتبہ ہے اور معاشرتی اور عوتی مصلحت کی رو سے نامناسب۔ جس طرح لنگڑا ہونا، کانا اور اندھا ہونا ایک حقیقت ہے اور لوگ لنگڑے، کانے اور اندھے ہوتے ہیں لیکن کیا ایسے لوگوں کو لنگڑا، کانا اور اندھا کہنا شریفانہ طرز گفتگو ہے؟ اسی طرح اگر واقعۃً مذکورہ تمام تفصیلات کی روشنی میں ایک شخص کا کافر ہونا بالفرض ثابت ہے تب بھی اس کو اس لفظ سے یاد کرنا مناسب نہیں ہے۔

صحیح اور درست لفظ انسانی برادری، برادران وطن، وطنی بھائی، یا اس کے بعد کے درجے میں غیر مسلم (نان مسلم Non Muslim) کہنا ہے، ایسے ہر لفظ سے گریز کرنا ضروری ہے جس میں

کسی انسان کی ذرا بھی بے احترامی ہو ۔

آدمیت احترامِ آدمی　　　　باخبر شو از مقامِ آدمی

کسی کو کافر کہنا کس قدر سنگین بات ہے!

یہاں ہمارے لیے اس لفظ "کافر" کے ساتھ جڑی ہوئی اس نزاکت پر بھی توجہ کرنا بہت ضروری ہے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو "اے کافر" کہہ کر مخاطب کیا تو فقد باء بها احد هما (ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہے) یعنی جس کو کہا گیا ہے اگر واقعۃً وہ اس کا مستحق تھا تو وہ لفظ اس پر صادق آ گیا اور اگر فی الواقع وہ شخص کافر نہیں ہے تو یہ جملہ خود کہنے والے کی طرف لوٹ گیا (بخاری عن ابی ہریرہؓ، احمد و بخاری عن ابن عمرؓ) یعنی جس کو یہ لفظ کہا گیا اگر وہ مومن ہے تب تو کہنے والا ہی کافر ہو گیا لیکن اگر وہ کوئی غیر مسلم ہے تو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ اس کے لیے بھی یہ لفظ بولنا ہر لحاظ سے خلافِ احتیاط، خطرناک، نامناسب اور بعض صورتوں میں خود اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال دینے والا ہے۔

پیام رحمت کے لیے انداز بھی نرم اور ہمدردانہ ہونا چاہیے

اسلام جیسی عالم گیر سچائی جو خدائے بے نیاز نے بھیجی ہے وہ چاہتا تو اس کے لیے انتہائی بے نیازی والا انداز بھی اختیار کر سکتا تھا وہ خود فرما چکا ہے ان اللہ غنی عن العالمین.

"بلاشبہ اللہ تمام عالموں سے بے نیاز ہے" (۳/۹۷)

لیکن اس کی رحمت و شفقت اور اپنے بندوں پر مہربانی کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام کو اور اخیر میں رحمۃ للعالمین کو نبی بنا کر بھیجا جو لوگوں کی تمام تر تختیوں، بد اخلاقیوں اور انتہائی ظلم و ستم کے باوجود کبھی غصے میں نہیں آتے تھے، ایک مرتبہ جب جنگ احد میں آپ دشمنان اسلام کے حملے میں زخمی ہو گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے صرف اتنا نکل گیا تھا کہ کیف یفلح قوم فعلوا هذا بنبيهم وهو يدعوهم إلى ربهم "وہ قوم بھلا کیسے

فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کے ساتھ یہ سلوک کرے جبکہ وہ (کچھ اور نہیں) صرف انہیں ان کے رب کی طرف دعوت دے رہا ہے''۔صرف اتنی سی بات پر یہ آیت نازل ہوگئی:

لیس لک من الأمرشئ أو یتوب علیھم أو یعذبھم فإنھم ظالمون ''اے رسول! آپ کو فیصلے کا کوئی اختیار نہیں ہے، بس اللہ ہی کو اختیار ہے وہ چاہے تو انہیں بخش دے یا انہیں سزا دے اس لیے کہ وہ ظالم تو ہیں ہی اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے وہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے''۔(سورت:۳،آیت:۱۲۸،۱۲۹)(رواہ احمد و مسلم عن انسؓ)

گویا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہی ہے وہ خود بھی بڑا بخشنے والا اور انتہائی رحیم ہے کہ آپ کے محبوب پر جن لوگوں نے تلواروں اور بھالوں سے حملے کر کے دانت شہید کر دئے اور چہرۂ مبارک زخمی ہو کر خون بہہ نکلا ان کے لیے اتنا لفظ کہنا بھی خدائے رحیم و کریم کو گوارا نہیں کہ ''بھلا یہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس کا سلوک یہ ہے!''۔

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کو کسی نے ذرا سخت لب و لہجے میں نصیحت کی تو اس نے بڑی عمدہ بات کہی، اس نے کہا:

> ''نصیحت نرمی سے کرو اس لیے کہ تم حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے بہتر نہیں ہو اور میں فرعون سے بدتر نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پیغمبروں کو بھی یہ ہدایت فرمائی تھی کہ فقولا له قولاً لینا لعله یتذکر أو یخشیٰ (تم دونوں اس سے نرم گفتگو کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کر لے اور خدا کا خوف کھائے)۔(۲۰/۴۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

من أمر بمعروف فلیکن أمرہ بمعروف، یعنی جو کوئی کسی کو اچھی بات بتائے تو اس کے بتانے اور سمجھانے کا انداز بھی اچھا ہی ہونا چاہئے۔(البیھقي في شعب الإیمان عن ابن

عمرؓ، تخریج الإحیاء للعراقي: ۲/۲۹۲، الجامع الصغیر للسیوطي: ۶/۸۸)

ہر گفتگو، تقریر اور تحریر کا ''مفہوم'' ہی اگرچہ اصل اور مقصود ہوتا ہے لیکن اس کی تعبیر و بیان، انداز گفتگو اور الفاظ اس مفہوم کا ''برتن'' ہوتے ہیں کوئی عمدہ غذا اگر ٹوٹے پھوٹے میلے کچیلے اور گھناؤنے برتن میں رکھ کر پیش کی جائے تو سامنے والا ہرگز اس کو پسند نہیں کرے گا، اگر آپ نے پیام رحمت کو باندازِ زحمت پیش کیا تو گویا آپ اپنی بات کو خود ہی نا قابل التفات بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اہل ایمان کے لیے ہر ایک کام میں یہ ہے کہ کام کو عمدہ اور بہتر طریقے پر کیا جائے (الجامع الصغیر رقم ۱۸۶۱، ج:۲، ص:۲۸۶) ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عمل میں حسن و خوبی اور عمدگی پسند فرماتا ہے۔ (حوالۂ بالا ۲/۲۸۷)۔

داعی کا دل رحمت و ہمدردی سے لبریز ہونا چاہیے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مشہور ارشاد گرامی ہے جو کئی صحابہ کرام سے متعدد محدثین نے نقل کیا ہے کہ الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم إلی اللہ أنفعھم لعیالہ یعنی ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبے کے لیے سب سے بڑھ کر فائدہ پہنچانے والا ہے۔ (الجامع الصغیر: ۳/۵۰۵)

ظاہر ہے کنبے میں سبھی لوگ اچھے نہیں ہوتے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں لیکن گھر کا ذمہ دار (فیملی کا ہیڈ) سبھی کی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے سبھی کو کھلاتا پلاتا اور اڑھاتا پہناتا ہے اور تمام ضروریات زندگی فراہم کرتا ہے۔

فرعون کو عالیشان حکومت، قارون کو بے اندازہ دولت، عاد و ثمود کو بے پناہ طاقت اور ایک سے ایک نافرمان انسانوں کو وافر مادی وسائل کون دے رہا ہے؟ سب کچھ اللہ ہی نے دیا ہے، دنیا کے ہر فرد کو کھانا پینا ضروریات زندگی، صحت و تندرستی غرض تمام وسائل اللہ تعالیٰ ہی

عطا فرماتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ظاہری مادی اور جسمانی ضروریات تو دے اور باطنی روحانی اور اخلاقی نعمتوں سے اپنی مخلوق کو محروم کردے؟ لیکن ظاہری اور دنیاوی ضرورتوں کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں فطری طور پر رکھدی ہیں جن کی مدد سے وہ ان ضروریات کو دنیا کے قدرتی خزانوں سے حاصل کرسکتا ہے۔

لیکن روحانی، باطنی اور اخلاقی نعمتیں انسان اپنی عقل وبصیرت سے حاصل نہیں کرسکتا اس لیے اس نے پیغمبروں کا سلسلہ رکھا ہے اور اب آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ پیغام ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد گرامی ہے کہ الدین النصیحة ''دین تو سراسر ہمدردی اور خیر خواہی کا نام ہے'' (مسلم، ابوداود، احمد، بزار وغیرہ)

انسان کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کھانا پانی موجود ہو اور وہ کسی شخص کو بھوک پیاس سے تڑپتا ہوا دیکھے تو کوئی شریف انسان اس شخص کو کھلائے پلائے بغیر نہ رہے گا، کیا کسی مسلمان کا دل اس بات کے لیے راضی ہوسکتا ہے کہ دنیا کے بے شمار انسان ہدایت سے محروم دنیا سے جارہے ہیں، بے دینی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کی رہائی کا ربانی کا نسخہ جو انہی کے لیے اس کے پاس امانت رکھا ہوا ہے وہ ان کو نہ پہنچائے؟ جبکہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہ قوم پیدا ہی اس کام کے لیے کی گئی ہے کہ اللہ کی مخلوق کو اللہ کا پیغام پہنچائے۔

اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی جو ہر انسان کے دل میں رکھی گئی ہے ایک صاحب ایمان کے دل میں یقیناً دوسروں سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور ہمدردی میں بھی فانی زندگی کے ساتھ فنا ہوجانے والی ہمدردی سے بڑھ کر وہ ہمدردی ہے جو ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں کام آنے والی ہے اور جو اس امت کا فریضۂ منصبی بھی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں ایک یہودی نوجوان رہتا تھا جو حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت بھی کرتا تھا، وہ بیمار ہوا آپ کو پتہ چلا تو آپ اس کی مزاج پرسی کو تشریف لے گئے اور اسے اسلام کی دعوت دی وہ (مشورہ طلب نظروں سے) اپنے والد کی طرف دیکھنے لگا، اسکے والد نے کہا أطع أبا القاسم (ابوالقاسم کی بات مان لو) چنانچہ اس نے اسلام قبول کرلیا، اس پر آپ بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکرادا کیا کہ اس نے میرے ذریعہ اس کو جہنم کی آگ سے نکال لیا، (بخاری عن انسؓ، مشکوٰۃ: رقم ۱۵۷۴)

یہ حسرت وتمنا رحمۃ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی کی ہونی چاہئے کہ انسانی برادری کا کوئی ایک فرد بھی ہماری کوشش کی حد تک جہنم کا حقدار نہ رہ جائے۔

دعوتی حس اور مدعو سے سچی ہمدردی وشفقت پیدا کریں

ایک داعی کے لیے اپنے پیغام سے پوری واقفیت، مخاطب کے ذہن ومزاج سے آگاہی اور مخاطب کی زبان پر قدرت وغیرہ یہ سب چیزیں انتہائی ضروری ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر جو چیز بنیادی ہے اور جس کے بغیر یہ تمام خوبیاں بھی بے اثر ہیں وہ ہے مدعو کے لیے سچی ہمدردی، گہری شفقت اور دعوتی لگن جس کو ہم ''دعوتی حس'' اور ''داعیانہ کشش'' کہہ سکتے ہیں۔

اگر ایک تندرست انسان دن بھر محنت یا سفر کرنے کے باوجود بھوک پیاس سے عاری ہو، ایک بظاہر صحت مند آدمی خوش ذائقہ کھانوں اور پھلوں کو زبان پر رکھ کر کڑوا بتائے، کسی شخص کی انگلیاں چیزوں کی ٹھنڈک اور گرمی کو محسوس نہ کریں تو ہم ایسے لوگوں کو ہر طرح صحت مند، تندرست اور فٹ (Fit) نہیں کہہ سکتے۔

جس طرح یہ صلاحیتیں ہیں بالکل اسی طرح آپ سمجھئے کہ ایک مسلمان اور مومن کو اللہ تعالیٰ نے خود ذاتی زندگی میں اسلام کی پیروی کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ہی ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی یہ پیغام پہنچانے کی ذمہ داری دی ہے، اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ان میں اولیں صلاحیت ''اللہ کی مخلوق کے ساتھ سچی ہمدردی اور شفقت ورحمت'' ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوبی سب سے بڑھ کر اور غیر معمولی حد تک حاصل تھی اسی لیے آپ کا لقب رحمۃ للعالمین ہے اور جب لوگ قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتے تھے تو آپ کو اپنے ستائے جانے کا تو رنج نہیں تھا لیکن اس غم میں آپ اپنی جان گھلائے دے رہے تھے کہ یہ لوگ اس پیغام ہدایت کو کیوں نہیں مان رہے ہیں! جیسا کہ قرآن مجید میں دو جگہ (سورت:۱۸، آیت:٦، اور سورت:٢٦، آیت:٣) میں اس کا ذکر آیا ہے کہ اے محمد! کیا آپ اس غم میں اپنے آپ کو گھلا کر ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ اس ہدایت پر کیوں ایمان نہیں لا رہے ہیں؟

جس طرح ایک بھوکا غذا کے لیے بے چین ہوتا ہے پیاسا پانی کے لیے تڑپتا ہے بالکل اسی طرح ایک داعی کو اللہ کی مخلوق کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے بے چین اور بے قرار ہونا چاہئے اور یہ صفت ہر پیغمبر کی فطرت میں جس حد تک اللہ تعالیٰ پیدائشی طور پر رکھتا ہے اس کے علاوہ اس مزاج کی پرورش بھی کی جاتی ہے چنانچہ ایک بار جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بکریاں چرانے کا ذکر کیا تو صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ کیا آپ نے بکریاں بھی چرائی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **نعم، ما من نبي الا وقدر عاها** (ہاں! اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں)۔ (الطبرانی فی الأوسط عن عبدالرحمنؓ بن عوف۔ مجمع الزوائد: ۸/۲۲۹)

بکری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ادھر ادھر جانے لگتی ہے، چرواہے کو اس کا ریوڑ لے کر چلتے وقت بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے ایک طرف کی بکریوں کو سنبھالے گا تو دوسری طرف کی بکھرنے لگیں گی، اس حرکت پر جب اسے غصہ آئے گا تو انہیں مار بھی نہیں سکتا، کمزور جان ہے ڈنڈا ذرا سخت لگ جائے تو ہڈی ٹوٹ جائے گی، اس لیے کنٹرول بھی کرنا ہے اور بکری کی کمزوری کی رعایت بھی کرنی ہے۔ اسی کیفیت میں روزانہ ایک عرصے تک رہتے رہتے چرواہے کی یہ عادت بن جاتی ہے کہ سامنے والے کی کجی، تند مزاجی اور ٹیڑھے پن کو برداشت کرتے ہوئے اس کو اپنی پسندیدہ راہ پر چلانے کی کوشش کرے۔

آپ طائف کا وہ مشہور واقعہ ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ وہاں کے لوگوں نے آپ کو بُرا

بھلا کہا، طعنے دیے، دھکے مار کر باہر نکال دیا اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ اوباش لڑکوں کو پیچھے لگا دیا جنہوں نے پتھر مار مار کر آپ کے قدموں کو لہولہان کر دیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی ان کے لیے بددعاء نہیں فرمائی بلکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام باصفا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بددعاء کرنے کی درخواست کی تو ؎

جناب رحمۃ اللعالمین نے سن کے فرمایا — کہ "میں اس دہر میں قہر و غضب بن کر نہیں آیا

اگرچہ لوگ آج اسلام پر ایمان نہیں لاتے — خدائے پاک کے دامانِ رحمت میں نہیں آتے

مگر نسلیں ضرور ان کی اسے پہچان جائیں گی • درِ توحید پر اک روز آ کر سر جھکائیں گی

بلکہ بحکم الٰہی پہاڑوں کے منتظم فرشتے نے آ کر بھی کہا اللہ کے رسول! ان لوگوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے دیکھا ہے اور مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ اگر آپ فرمائیں تو طائف کی پوری آبادی کو دو پہاڑوں کے بیچ میں لے کر پیس ڈالوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی انکار فرمایا اور اہل طائف کے حق میں دعائے خیر ہی فرمائی ؎

دعا مانگی الٰہی قوم کو چشمِ بصیرت دے — الٰہی رحم کر ان پر، انہیں نور ہدایت دے

فراخی ہمتوں کو روشنی دے ان کے سینوں کو — کنارے پر لگا دے ڈوبنے والے سفینوں کو

الٰہی فضل کر کہسارِ طائف کے مکینوں پر

الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر

صرف صبر ہی نہیں بلکہ دعاء بھی دینے کا راز

آپ یہاں بھی دیکھ رہے ہیں اور آگے آخری بات کے زیر عنوان بھی ایک واقعہ آ رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے حد سے زیادہ تکلیف دینے پر بھی صرف صبر کر لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان ستانے والوں کے لیے دعاء بھی فرمائی، اس میں ایک بڑا راز پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام اہل ایمان کو قرآن مجید میں جگہ جگہ صبر کی تلقین فرمائی ہے لیکن دعوت کے میدان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ ﷺ کیساتھ ہر داعی اسلام کو حکم دیا ہے کہ فاصبر

صبرا جمیلاً (لوگ ماریں پیٹیں مذاق اڑائیں تو آپ ''عمدہ قسم کا صبر'' کیا کریں) (۷۰/۵)
صبر کرنا تو یہ بھی ہے کہ آپ ظلم کا انتقام نہ لیں، بددعاء نہ کریں، کسی سے گلہ شکوہ نہ کریں، اسے دل میں نہ رکھیں، لیکن ایسا کرنے سے ایک دوسری فائل کھل جاتی ہے یعنی ظالم کے خلاف اللہ کا غیظ وغضب جوش میں آجاتا ہے اور وہ ظالم کو پکڑ لیتا ہے حدیث قدسی ہے جو کئی محدثین نے متعدد صحابہ کرام سے مختلف الفاظ میں نقل کی ہے: **من عادی لی ولیا فقدناصبنی بالمحاربة** (جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرتا ہے اس نے مجھ سے جنگ کا اعلان کر دیا ہے)۔ (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۲۶۹) آخر طائف میں فرشتہ عذاب دینے کیلئے آہی گیا تھا، مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

ہیچ قومے را خدا رسوانہ کرد
تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

(اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک ذلیل وخوار نہیں کرتا جب تک کہ وہ کسی دل والے (اللہ کے پسندیدہ) بندے کا دل نہیں دکھاتی)۔

''صبر جمیل'' یعنی ''عمدہ قسم کا صبر'' یہ ہے کہ آدمی نہ صرف ظلم سہہ کر خاموش ہو جائے، انتقام نہ لے بلکہ ظالم کو معاف کر دے اور اس کے لیے ہدایت کی دعاء کرے، یہ دعوت اسلام کے آداب میں ایک اہم ادب ہے۔ صرف اسی قدر نہیں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات بڑے ہی عجیب وغریب ہیں، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخص آئے اور انہوں نے کوئی بات چیت کی حضرت عائشہؓ اس واقعے کی راوی ہیں وہ فرماتی ہیں بات کیا تھی یہ تو میں سن نہیں سکی لیکن ان دونوں کے رویئے سے آپؐ کو سخت غصہ آگیا اور آپ کی زبان مبارک سے ان کے لیے کچھ سخت سست نکلا (جو آپ کی ہمیشہ کی دعات کے برخلاف تھا) جب وہ چلے گئے تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر توجہ دلائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا! مجھے تو توجہ ہی نہیں ہوئی کہ میں نے (ان کے بارے میں) اپنے رب سے کیا کہہ دیا؟
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی کہ:

"پروردگار! میں آپ سے ایک عہد لیتا ہوں آپ ہرگز اس کے خلاف نہ کیجئے گا کہ میں بھی ایک بشر ہوں لہٰذا اگر میں کسی مومن یا مومنہ کو تکلیف پہنچا دوں یا اسے سخت سست کہہ دوں یا مار پیٹ کر دوں یا اسے لعنت ملامت کر دوں تو اسے ان کے حق میں دعاء بنا دیجئے، ان کی پاکی کا ذریعہ بنا دیجئے اور اس بات کو قیامت کے دن اس بندے کی اپنے سے قربت کا وسیلہ بنا دیجئے" --(بخاری مسلم-الجامع الصغیر: ۱۵۳/۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے انسان پر رحم نہیں کرتا جو انسان کے ساتھ ہمدردی اور رحم نہ کرتا ہو۔ (بخاری مسلم عن جریرؓ بن عبداللہ، المشکوٰۃ رقم: ۴۹۴۷)

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے ابوالقاسم صادق ومصدوق (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس شخص کے دل سے رحم اور ہمدردی نکل جائے وہ کوئی بد بخت و بدنصیب ہی ہوسکتا ہے۔ (احمد، ترمذی-مشکوٰۃ رقم: ۴۹۶۸)

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رحمان (اللہ تعالیٰ) رحم کرنے والوں پر ہی اپنی رحمت بھیجتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔
(ابوداود، ترمذی، عن عبداللہ بن عمروؓ-المشکوٰۃ رقم: ۴۹۶۹)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں روزی عطا کی ہے (کسی کو کم کسی کو زیادہ) اسی طرح اس نے تمہارے درمیان (اچھے) اخلاق تقسیم کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیاوی نعمتیں تو اپنے پسندیدہ بندوں کو بھی دیدیتا ہے اور ناپسندیدہ کو بھی لیکن دین (واخلاق اور شریفانہ عادات واطوار) صرف اپنے پسندیدہ بندوں ہی کو دیا کرتا ہے، بس (یہ پہچان سمجھ لو کہ) جسے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں بخشی ہیں وہ اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے"۔
(احمد، بیہقی فی شعب الایمان عن ابن مسعودؓ-المشکوٰۃ رقم: ۴۹۹۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی پہچان یہ بتائی ہے کہ وہ محبت وشفقت کا پتلا ہوتا ہے

(وہ بھی ہر ایک سے محبت وشفقت کرتا ہے اور لوگ بھی اس سے محبت وشفقت سے ملتے ہیں)۔ اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں ہے جو نہ خود وہ کسی سے محبت کرے اور نہ کوئی دوسرا اس سے محبت کرے۔ (احمد، بیہقی فی شعب الایمان عن ابی ہریرہؓ۔ المشکوٰۃ رقم: ۴۹۹۵)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال تو ایسی سمجھو کہ ایک شخص نے آگ جلائی جب وہ خوب دہک گئی اور روشن ہوگئی تو پروانے آآ کر اس میں گرنے لگے اور وہ (ہمدردی میں) ان کو ہٹانے لگا اور وہ زبردستی اس میں گرے جارہے ہیں (یہی حال میرا ہے) میں بھی تمہیں (تمہارے پیچھے سے) تمہارے پہلو پکڑ پکڑ کر آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے چلے جاتے ہو۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرہؓ المشکوٰۃ رقم: ۱۴۹)

خود کو قابل اعتبار باور کرائیے

کسی آدمی کا صرف اپنی ذات سے سچا ہونا، ہمدرد وخیر خواہ ہونا، شریف اور باکردار ہونا ہی کافی نہیں بلکہ عملی تجربے سے دنیا خود بھی پرکھ کر جان لے کہ آپ واقعی سچے ہمدرد وبہی خواہ ہیں، کسی وقتی جذبے اور ہنگامی مصلحت کے تحت خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کررہے ہیں بلکہ یہی آپ کا مزاج ہے، جب تک کوئی شخص آپ کو اپنا سچا ہمدرد وبہی خواہ نہیں سمجھے گا تو آپ کی بات کیوں مانے گا، آپ کی دعوت کا جاندار ومؤثر ہونا ہی کافی نہیں بلکہ آپ کا ہمدردانہ انداز بھی آپ کی دعوت کو مؤثر بنائے گا۔

اور ہمدردی وخیر خواہی کوئی ایسی منطقی اور عقلی چیز نہیں ہے کہ آپ کسی کے سامنے دلائل سے اسے ثابت کردیں بلکہ آپ کا طرز عمل آپ کا گفتار وکردار اور ہر معاملے میں سامنے والے کے ساتھ آپ کا رویہ یہ ثابت کرے گا کہ آپ واقعی اس کے اور تمام انسانیت کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں۔

کسی کے شخصی، قومی، علاقائی نقائص اور خامیوں کو بالکل نہ چھیڑیں، نہ اجتماعی گفتگو میں نہ نجی سے نجی اور شخصی ملاقات میں، اگر کسی کی شخصی خامی وکوتاہی پر توجہ دلانی ہو تو اس کے لیے بہت

ہی مناسب تعبیر اختیار کریں اور بالکل تنہائی میں سمجھائیں۔

کسی قوم اور برادری یا کسی علاقے، کسی پیشے کی نام نہاد بلندی یا پستی، کسی قوم کا کوئی مشہور قومی عیب، کسی قوم و ملک کی مزاجی خامی، رنگ ونسل کا فرق غرض جتنی چیزیں بھی انسانوں کے درمیان حد بندیاں بناتی اور دوریاں قائم کرتی ہیں ان تمام باتوں سے داعی کا ذہن بالکل خالی ہو جانا ضروری ہے۔

اگر تمام تر دعوتی حکمت عملی اور ہر طرح کی خیر خواہی کے باوجود کوئی شخص آپ کی بات نہیں مانتا تب بھی آپ کو اس سے ناراض ہونے، منھ پھیر لینے اور بے رخ ہو جانے کا حق نہیں ہے، آپ اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ جو شخص اللہ کا پیغام نہیں مانتا وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ لاعلمی میں خود اپنا نقصان کرتا ہے اس لیے آپ کا اس سے ناراض ہونا بالکل بے جا ہے، بلکہ غور یہ کرنا چاہئے کہ شاید سمجھانے ہی میں مجھ سے اور ہمارے داعیوں سے کوئی کمی رہ گئی ہے ورنہ اچھی بات کو تو ہر شخص قبول کرے گا۔ آخر اپنے فائدے کے سودے سے کون منھ موڑے گا؟

آخری بات

ایک آخری بات جس کا تعلق اصلاً مدعو سے نہیں بلکہ داعی سے یعنی ہم سے اور آپ سے ہے یہ ہے کہ دلوں میں خیر کی بات کا اتارنا اور ہدایت دینا تو اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور سید الانبیاء کے ہاتھ میں بھی نہیں دیا بلکہ حکم دیا کہ ”آپ تو اے نبی! اپنی بات سمجھاتے رہئے اور سمجھانے کا حق ادا کر دیجئے، ہدایت دینا نہ دینا یہ ہمارا کام ہے“ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح دعوت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کیا کیجئے کہ پروردگار! اپنے بندوں کو ہدایت عطا فرما، دعاء بھی مومن کے پاس چونکہ ایک ہتھیار ہے اس لیے اس سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے ان کے لیے دل سوزی سے راتوں کو اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعاء بھی فرماتے تھے، یہ دعائیں افراد کے لیے بھی ہوتی تھیں اور قبائل کے لیے بھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتا تھا وہ قبول نہیں کرتی تھیں ایک روز انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کیں میں روتا ہوا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی والدہ کی ہدایت کے لیے دعاء کی درخواست کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ”اللّٰھم اھد أم أبي هريرة“ (اے اللہ! ابو ہریرہ کی والدہ کو ہدایت دے) یہ دعاء سن کر حضرت ابو ہریرہؓ خوش خوش گھر گئے، دیکھا دروازہ اندر سے بند ہے اور پانی گرنے کی آواز آرہی ہے ان کی والدہ نے ان کے قدموں کی چاپ سنی تو کہا ابو ہریرہ ٹھہرو، اس کے بعد انہوں نے کپڑے پہن کر دروازہ کھولا وہ غسل کر رہی تھیں۔

حضرت ابوہریرہؓ اندر گئے تو ان کی والدہ نے کہا اشهد ان لاالٰه الا اللّٰه واشهد ان محمداً عبده ورسوله حضرت ابوہریرہؓ پھر خوشی کے آنسو آنکھوں میں لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور (خوش خبری سنائی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔
(مسلم واحمد:۲/۳۲۰۔المشکوٰۃ رقم:۵۸۹۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبہ کے لیے بھی دعا فرمائی تھی۔(البدایۃ والنہایۃ:۴/۳۳۳، مجمع الزوائد:۶/۱۸۳) اسی طرح آپ نے قبیلہ بنو عامر کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی (تہذیب تاریخ دمشق لابن عساکر:۷/۲۰۲) قبیلہ ثقیف کی ہدایت کے لیے دعا فرمائی، (ترمذی، احمد۳/۳۴۳۔ مشکوٰۃ رقم:۵۹۸۶) قبیلہ دوس کی ہدایت کے لیے بھی دعا فرمائی (بخاری، مسلم۔مشکوٰۃ رقم:۵۹۹۶)

ایک مرتبہ موسم حج میں عرب کے تمام قبائل جمع تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید کی اور اپنے رسول اللہ ہونے کی دعوت پیش کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بیان ہے کہ اس مجمع میں کوئی مرد کوئی عورت اور بچہ ایسا نہیں بچا جس نے مٹی اور پتھر میرے اوپر نہ مارے ہوں اور میرے منھ پر نہ تھوکا ہو وہ یہ سب کرتے جاتے تھے اور مجھے بے دین اور جھوٹا کہتے جاتے تھے۔

اسی حال میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا: محمد! اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو اب وقت آ گیا ہے کہ نوح (علیہ السلام) کی طرح تم بھی اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کرو لیکن ۔سبحان اللہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دعاء فرمائی!

اللّٰهم اهدِ قومي فإنهم لايعلمون. ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے وہ جانتے نہیں ہیں''۔(الدر المنثور:۲/۲۹۸)

یہ دعا تو تمام قبائل کے لیے تھی لیکن قریش کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دعاء بھی فرمائی تھی (حلیۃ الاولیاء:۹/۶۵) یہ دعاء کرنا جہاں بندوں کے حق میں اللہ کی رحمت کو کھینچنے کی تدبیر ہے وہیں خود اپنے باطن میں ربانی برقی قوت بڑھانے کا بھی کامیاب ذریعہ ہے، دعوتی مہم اور اللہ کا پیغام اللہ کے بندوں کو پہنچانا ایک بھاری ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری اسی قدر آسان ہوگی جس قدر آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنا باطنی تعلق بڑھائے گا۔

قرآن مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی پیغمبرانہ خدمات کے شروع ہی دور میں ہدایت کی گئی تھی کہ ہم آپ کے اوپر عنقریب ایک بھاری بوجھ (ایک زبردست ذمہ داری) ڈالنے والے ہیں اس لیے راتوں کو اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہا کیجئے یہ نفس کشی اور ریاضت ومحنت آپ کی مشکل کو آسان کر دے گی اور آپ کی بات میں تاثیر پیدا ہوگی، وہ تاب وتواں اور وہ طاقت وہمت جس سے دعوتی مہم میں جان پڑتی ہے وہ قیام لیل ہی کے ذریعے حاصل ہوگی۔
مخاطب کے سامنے دین کا پیغام پیش کرنے کے لیے جو معلومات درکار ہیں ان کی ضرورت واہمیت کا سمجھنا تو آسان ہے، لیکن کتاب کے اخیر میں چند سطروں میں اس ماخذ ومصدر (سورس) کا لکھنا بھی ضروری ہے جس کی طرف بسا اوقات توجہ نہیں ہوتی اور وہ مصدر وماخذ اللہ کی یاد اور راتوں میں تنہائی کی عبادت اور دعاء ہے۔

داعی کی حیثیت ایک دکاندار کی سی ہے اگر کوئی دکاندار اپنے سے بڑے تھوک بیوپاری سے مال لاتے رہنے کا اہتمام نہ کرے تو ایک وقت آئے گا کہ اس کی دکان کا سودا ختم ہو جائے گا اور دکان خالی ہو جائے گی، اگر کنویں میں سوتوں سے تازہ پانی آتے رہنے کا سلسلہ بند ہو جائے یا کھچنے کی مقدار آنے کی مقدار سے بڑھ جائے تو ایک وقت آئے گا کہ پانی گدلا آنے لگے گا اور اس کے بعد پھر کیچڑ آنا شروع ہو جائیگی، اس لیے ایک طرف ہم اگر تقسیم کرتے رہیں تو دوسری طرف اپنے سے زیادہ اہل علم حضرات سے علم وتجربہ اور اللہ کے غیبی خزانے سے توفیق وتاثیر بھی حاصل کرتے ہیں۔

آپ کی دعوت چاہے زبانی ہو یا تحریری، شخصی ہو یا اجتماعی یا دیگر جدید ترین ذرائع ووسائل کے ذریعے ہو بہر حال تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رو رو کر جب تک دعا نہیں ہوگی دعوت میں اندرونی تاثیر پیدا نہیں ہوگی، تاثیر پیغام رسانی کے الفاظ وتعبیرات اور پیرایۂ بیان میں نہیں ہوتی بلکہ دل کی اندرونی قوت سے ہوتی ہے جس کے تار ربانی بجلی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

الہ العالمین! ہمیں اپنے دین کا پیغام سلیقے سے اپنے بندوں تک پہنچانے کی توفیق دے اور اس کو مؤثر ومفید بنا۔ فاللہ الموفق وهو أرحم الراحمين، وهو حسبنا ونعم الوكيل.

نضر اللّٰہ امرأ سمع منا حدیثا فبلغہ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری
کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام
کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان
کی گئی ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

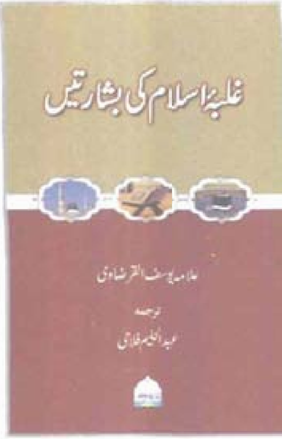
مکتبہ قاسم العلوم

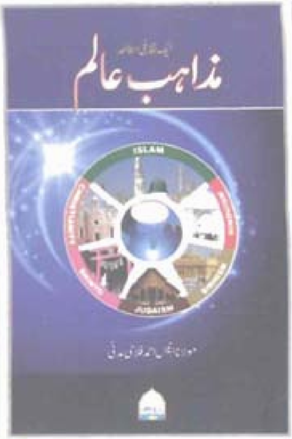
تذکیر القرآن

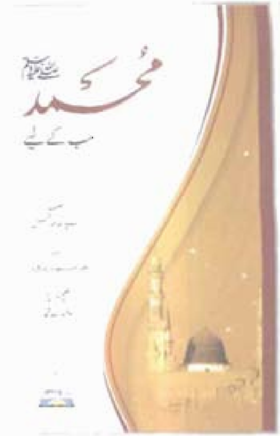
جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

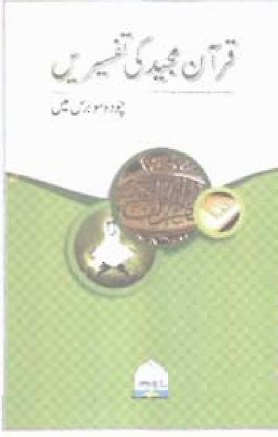
قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

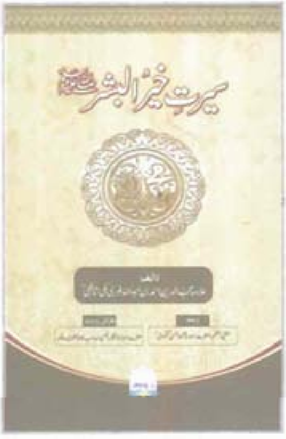
رحمٰن مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۳۱۱۱۹

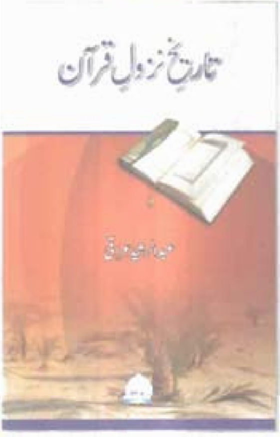

غلبۂ اسلام کی بشارتیں
علامہ یوسف القرضاوی
ترجمہ
عبدالحلیم فلاحی


مذاہب عالم
ISLAM
JUDAISM


محمد ﷺ
سب کے لیے


قرآن مجید کی تفسیریں
چودہ سو برس میں


سیرت خیر البشر ﷺ


تاریخ نزول قرآن